بہشتی پیداواروں کی ہلکی سی جھلک

از

مولانا مناظر احسن گیلانی قدس اللہ سرہ

پانچ اقساط پر مشتمل مقالہ

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند
دسمبر 1954ء، مارچ تا جون 1955ء

بہشتی پیداواروں کی ہلکی سی جھلک

(از حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی)

کتاب و سنت کا صحیح علم، طاعاتِ الٰہی کا ایک بڑا ذریعہ اور معرفتِ حق کا ایک بڑا سبب ہے علم کی برتری خود نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے اور امت کے ہر مکتبِ خیال نے ہر دور میں کتاب و سنت کے علم کو دوسرے تمام ملکاتِ فاضلہ سے مقدم جانا ہے، اربابِ تصوف میں سے حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ:-

"جو کتاب و سنت سے واقف نہیں وہ سیر و سلوک میں لائقِ اتباع نہیں، اس لئے کہ ہمارا علم تصوف کتاب و سنت کا پابند ہے"

حافظ ابن قیمؒ مدارج السالکین میں رقمطراز ہیں کہ:-

"ان حضرات (حضرات صوفیہ) نے علم شریعت کی سخت تاکید کی ہے علم کے بغیر سلوک کی ممانعت فرمائی ہے اور جس نے علم شریعت سے اعراض کیا اُس سے دُور رہنے کا انہوں نے حکم دیا ہے"۔ (ج ۱ ص ۸۵)

کتاب و سنت کے علم کے متعلق یہی خیال دین و مذہب کی اپنی اپنی راہوں اور اپنے اپنے طریقوں سے خدمت اور اسکی بقا کی کوشش کرنیوالے تمام افراد نے ظاہر کیا ہے، یہ سب حضرات خدمتِ دین کے لئے الگ الگ طریقے رکھتے ہیں۔ لیکن طرق کی یہ کثرت اس وحدت پر جاکر ختم ہو جاتی ہے کہ ان سب کا منتہائے نظر طاعتِ الٰہی، معرفتِ حق، عبودیت، کمالِ اتباع، خدا کے ساتھ اخلاص اور کتاب و سنت کی مشغولی ہے۔

کتاب و سنت کے صحیح علم کی جو شمع بھی کہیں روشن ہے وہ پوری اُمت کے لئے قابلِ عزت و استفادہ ہے، اگر اپنے دینی فوائد کے لئے اس شمع کو طوفانِ باد و باراں سے محفوظ رکھنے کی سعی کی جائے تو وہ بجا ہے اور اس کی سلامتی اور زندگی کے لئے دُعا کی جائے تو وہ صحیح ہے۔

مولانا گیلانی، اس دور میں علوم کتاب و سنت کے اُن حاملین و فاضلین میں سے ہیں جن کی وسعتِ مطالعہ، استحضار فی العلم، حفظ اور اتقان ذکاوت، اور ذہانت تو اپنی جگہ صفاتِ کاملہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ ان کے یہ سب فضائل کتاب و سنت کی تفصیل و تشریح اور حدیث و قرآن کی خدمت و حمایت کے لئے صرف ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پورا حلقۂ علمی اس خبر سے فکر محسوس کریگا کہ مولانا گیلانی کئی ماہ سے علیل ہیں اور یہ بیماری ممتد ہونے کے ساتھ اپنے مختلف مراحل میں شدید بھی رہی ہے۔ ہم سب کو حضرت مولانا کی صحت و سلامتی کے لئے پوری توجہ کے ساتھ دُعا کرنی چاہیے، یہ دُعا بجائے خود ایک نیکی اور عملِ خیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

میں جس قصہ کا تذکرہ اس وقت کرنا چاہتا ہوں اگرچہ پایا تو جاتا ہے یہ عربی اور فارسی کی متعدد کتابوں میں۔ لیکن مشہور محدث، صاحب مستدرک الحاکم کے حوالہ سے علامہ تاج الدین السبکی اپنی کتاب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں اگر اسے درج نہ فرماتے، تو شاید اس کے ذکر کی ہمت مجھ میں پیدا نہ ہوتی۔ با ایں ہمہ نہیں کہہ سکتا کہ عہد جدید کی تشکیلی ذہنیت رکھنے والے اس کے بعد کہاں تک اس کی واقعیت پر بھروسہ کر سکتے ہیں، کاش! الحاکم اور السبکی جیسے بزرگوں کی جلالت شان سے لوگ واقف ہوتے۔ میرے لئے اس کا موقعہ نہیں ہے کہ اُن کے تفصیلی حالات اور اُن کی روائیتوں پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے، اس پر بحث کروں۔

کچھ بھی ہو، اتنا تو بہر حال تسلیم ہی کر لینا چاہیے، کہ حاکم اور السبکی تک نے جب اپنی کتابوں میں اس قصے کا ذکر کیا ہے، تو اسلامی تاریخ کے لحاظ سے اس کو فقط ایک پادر ہوا قصہ یا خیالی افسانہ ٹھیرا دینا بڑی زیادتی ہوگی۔ آخر طبقہ[1] افکیہ سے تعلق رکھنے والے افراد کچھ اسی زمانہ ہی کے ساتھ جب مخصوص نہیں ہیں، بلکہ قرآن کی شاہد ہے کہ ایام جاہلیت میں بھی افکی ذہنیت والے پائے جاتے تھے۔ تو ان کی پرواہ کہاں تک اور کیوں کی جائے۔

بہر حال یہ قصہ خوارزم کے شہر ہزار سپ نامی کا ہے، خوارزم اسی علاقہ کا نام ہے جسے اس زمانہ میں لوگ خیوہ کہتے ہیں، اسی علاقہ کی ایک آبادی ہزار سپ بھی تھی، جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے، عربی میں ہزار سپ کا تلفظ "ہزار شف" کیا کرتے تھے۔ پہلی صدی ہجری میں عربوں نے خوارزم کے سارے علاقے کو فتح کر لیا تھا، حال میں بنی امیہ کے عہد کے کچھ سکے اس سرزمین سے برآمد ہوئے ہیں جن پر سنہ ۷۹ھ کندہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عملداری میں یہ علاقہ سنہ ۷۹ھ میں آچکا تھا (دیکھو جغرافیہ خلافت مشرقی حاشیہ صفحہ ۶۹۵) اور یہی کیا شمال میں حدود چین تک جب مسلمان پہونچ چکے تھے، جس کی یادگار آج تک ہماری فقہی کتابوں میں "فتاویٰ اسبیجابی" کے نام سے باقی ہے، اسبیجاب ترکستان کا آخری سرحدی علاقہ تھا، جہاں مسلمانوں کے جوامع اور مساجد مدارس پھیلے ہوئے تھے۔ جی، بی اسٹرینج نے لکھا ہے کہ

> "شاش کے شمال میں سیحون کے کنارے مشرق کی طرف پھیلا ہوا اسبیجاب کا وسیع علاقہ یا صوبہ تھا۔" (ص ۵۷۰)

اور کچھ نہیں، تو ہمارے مدارس میں اصول شاشی اصول فقہ کے مشہور متن کی وجہ سے شاش کے نام سے لوگ مانوس ہیں، اسی علاقہ میں فاراب بھی تھا، جہاں کے ایک قصبے وسیج نامی میں مشہور حکیم ابو نصر فارابی پیدا ہوا تھا، اسلامی علوم کا چرچا ان دور دست علاقوں میں کس پیمانے پر پھیلا ہوا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ خوارزم کے ایک شہر زمخشر نامی میں علامہ زمخشری جار اللہ پیدا ہوئے تھے، جن کی تفسیر کشاف آج بھی بعض پہلوؤں کے لحاظ سے بے نظیر سمجھی جاتی ہے، حالانکہ زمخشری کے اعتزالی عقائد کی وجہ سے علماء اہل سنت ہمیشہ اس سے بے زاری کا بھی اظہار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن تفسیر

[1] قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس میں ایام جاہلیت کے بعض جاہلوں کے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ آبائی روایات یعنی پرانے باپ دادوں سے منتقل ہوتی ہوئی جو روائتیں ہم تک پہونچی ہیں اور جو طریقہ کار ان کا تھا اُن سب کی صداقت و صحت کے لئے یہ کافی ہو کہ ہمارے باپ دادے اُن پر بھروسہ کرتے تھے، اسی آبائی معیار پر صداقتوں کو پرکھنے والوں کے معاملہ میں جاہلیت ہی کے زمانہ میں قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے ایک طبقہ اُن لوگوں کا بھی تھا، جو ہر اس چیز کو جھٹلا دینے کے عادی تھے جو الاولین یعنی گذشتہ نسلوں کی طرف منسوب تھی ان ھٰذا الا اساطیر الاولین "نہیں ہے یہ لیکن اگلے لوگوں کی کہانیاں"، ان ھٰذا الا افک قدیم "نہیں ہے یہ مگر پرانا جھوٹ"، ان ہی الفاظ میں پچھلے گروہ کے معیار کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے اسی لئے پہلے جاہلی طبقہ کو میں آبائیہ کے نام سے موسوم کیا کرتا ہوں، اور جاہلوں کے دوسرے طبقہ کا نام افکیہ "افک قدیم" کی مناسبت سے رکھ چھوڑا ہے

قرآن میں کشاف کے درس و مطالعہ کی ضرورت ہر زمانہ میں محسوس کی گئی ہے۔ خوارزم کے اہلِ علم اور اربابِ تصنیف کیلئے مستقل دفتر کی ضرورت ہے، اس وقت ذکر ہزار اسپ خوارزم کے شہر کا تھا۔ اس شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے اسٹرینج نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ ایک بڑا مقام ہے، جس کا نام اسلامی فتوحات سے اب تک نہیں بدلا ہے۔"

مقدسی کے حوالہ سے اس نے یہ خبر بھی دی ہے کہ:۔

"شہر (ہزار اسپ) کے دروازے چوبی تھے اور شہر کے گرد خندق تھی۔"

ساتویں صدی ہجری میں یاقوت بھی ہزار اسپ پہونچا ہے اس کا بیان ہے کہ:۔

"اس کی فصیل اور دمدمے مستحکم تھے، شہر بہت متمول تھا اس میں عمدہ بازار تھے، ہزار اسپ اپنی نہروں کے پانی سے قریب قریب گھرا ہوا تھا، شہر تک پہنچنے کے لئے صرف ایک راستہ تھا یہ راستہ اس مرغزار میدان میں ہے جو جیحوں کے کنارے پھیلا ہوا ہے، ایک بلند سنگین روش سے برابر گذرتا ارگنج[۱] کی سمت سے شہر تک آیا تھا۔" (صفحہ ۲، جغرافیہ خلافت شرقی)

اب اس روایت کو سنئے جسے السبکی نے الحاکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے، الحاکم اپنی تاریخ نیشاپور میں بیان کرتے ہیں کہ ابو زکریا عنبری سے میں نے سنا، وہ کہتے تھے کہ عیسیٰ بن محمد الطہانی جن کی کنیت ابو العباس تھی اپنے اس چشم دید واقعہ کا ذکر مجھ سے کیا، کہتے تھے کہ ۲۳۸ھ ہجری میں خوارزم کے شہر ہزار اسپ (شف) میں پہونچا، جو دریائے جیحوں کے مغربی ساحل کی ایک آبادی ہے، ہزار شف اور خوارزم کے سب سے بڑے شہر (ارگنج جرجانیہ) کے درمیان فاصلہ نصف دن کا ہوگا یعنی دو پہر تک ارگنج سے چل کر آدمی ہزار اسپ پہنچ جاتا ہے۔ جب میں ہزار اسپ میں داخل ہوا، تب مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ ایک شخص جو شہید ہو گیا تھا، اس کی بیوی نے خواب میں دیکھا کہ اسے کچھ کھلا دیا گیا ہے۔ جب سے بیدار ہوئی ہے نہ وہ کچھ کھاتی ہے اور نہ پیتی ہے، میں نے لوگوں کو اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے پایا۔ لیکن خود اس عورت سے ملاقات کرنے کا موقعہ نہ مل سکا، اس کے بعد دوبارہ ۲۴۲ھ یعنی چار سال بعد ہزار اسپ میرا آنا ہوا، اور اس عورت سے میں ملا بھی۔ لیکن اس زمانہ میں میری عمر زیادہ نہ تھی، باتیں جو اس نے بیان کی تھیں نہ صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکیں اور نہ یاد ہی رہیں۔ تیسری دفعہ ۲۵۲ھ میں ہزار اسپ میں پھر پہنچا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہی عورت اس وقت تک زندہ ہے، اور لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا ہوا ہے، چونکہ ہزار اسپ تجارتی قافلوں کی کاروانی سڑک پر واقع تھا، اس لئے مختلف ممالک کے رہنے والوں کی گذر اس شہر میں ہوتی، اس عورت کے قصے کو سننے کے بعد قدرتاً اس سے ملنے کا شوق لوگوں میں پیدا ہوتا، اسی لئے یہ عورت ہزار اسپ میں اس درجہ مشہور ہو چکی تھی، کہ کسی سے پوچھئے، بچہ ہو، جوان ہو، مرد ہو عورت ہو، سب ہی اس کا اور اس کے گھر کا پتہ بتا دیتے، اس دفعہ یعنی ۲۵۲ھ میں جب میں ہزار اسپ پہونچا، تو اس خاتون سے ملنے کی خواہش مجھ میں پھر پیدا ہوئی، لیکن جب اس کے گھر پہونچا، تو معلوم ہوا کہ کسی دوسری جگہ کسی ضرورت سے گئی ہے، یہ مقام جہاں وہ گئی ہوئی تھی، ہزار اسپ سے چند میل دور تھا، میں اس مقام کا پتہ دریافت کرتے ہوئے، ہزار اسپ سے باہر نکلا، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پہونچنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہی عورت سامنے سے چلی آرہی ہے، رفتار میں کسی قسم کے ضعف کی علامت نہیں پائی جاتی تھی، میں جب اس کے قریب پہونچ گیا، تو میں نے پایا کہ معتدل قد و قامت کی یہ عورت ہے، حسن و جمال سے بھی

---

[۱] ارگنج کو ایرانی گرگنج کہتے تھے، عربی تلفظ میں یہی گرگنج "جرجانیہ" ہو گیا، لاکھوں کی آبادی رکھنے والا یہ شہر تھا، تاتاری فتنہ میں شہر اس طریقہ سے تباہ ہوا کہ دریائے جیحوں کا دھارا تاتاریوں نے بدل دیا، پشتے شہر کے ڈھا دیئے، پورا شہر غرقاب ہو گیا۔ ۱۲

کافی حصّہ اس کو ملا ہے، اس کے دونوں رخسارے سُرخ تھے، مُلاقات کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ بڑی بیدار مغز، اور سنجیدہ دل و دماغ رکھتی ہے، اب میں بھی اس کے ساتھ ہزار اسپ کی طرف پلٹ پڑا، میں سواری پر تھا، اور عورت پیدل چل رہی تھی، میں نے سواری پیش بھی کی، لیکن اُس نے انکار کر دیا، اور میرے ساتھ وہ پیدل ہی چلتی رہی۔ میں نے اس عورت سے اس کا نام پوچھا، بولی کہ میرا نام رحمت بنت ابراہیم ہے، پھر اپنی سرگذشت وہ ان الفاظ میں بیان کرنے لگی، کہ میرا شوہر بڑھئی (نجار) تھا، مزدوری اُس کو اسی قدر مل جاتی تھی، جس سے اس کا کام چل جاتا تھا، اس شوہر سے چند بچے بھی ہوئے، ہم لوگ اسی حال میں تھے کہ ترکستان کے اس حصہ سے جس پر مُسلمانوں کا قبضہ نہیں ہے، "الاقطع" نامی ترک سردار نے جو غیر مسلم تھا، اس آبادی (یعنی ہزار اسپ) پر حملہ کر دیا، اور فصیل تک اس کے پہونچ گیا۔ ہزار اسپ کے باشندے اگرچہ قلعہ بند ہو گئے۔ لیکن نوجوانوں نے باہر نکل کر ان کافر ترکوں سے مقابلہ کرنا چاہا گھمسان کی لڑائی ہوئی، دونوں طرف کے لوگ مارے گئے ہزار اسپ میں مُسلمانوں کے چار سو جنازے پہونچے، گویا ہر گھر میں اس کی وجہ سے ماتم برپا تھا، اُن ہی مقتولوں میں اس عورت نے بیان کیا کہ غریب میرا شوہر بھی تھا، جسے دیکھ کر مجھ پر وہ سارے حالات طاری ہو گئے، جو کل اولاد رکھنے والی عورت پر شوہر کی موت سے طاری ہو سکتے ہیں، میں نے رونا دھونا شروع کیا، چیختی، اور چلاتی تھی، برادری اور محلہ کی عورتیں مجھے تسکین دیتی تھیں، میرے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اُنہیں کچھ معلوم نہیں کہ اُن پر کیا گذر گئی، حسب دستور وہ مجھ سے روٹی مانگتے تھے، اور میرے پاس کچھ نہ تھا، صرف اُن کی تسلی کر رہی تھی کہ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی، میں نماز پڑھنے کی طرف متوجہ ہوئی، نماز کے بعد اپنے پروردگار کے آگے گڑگڑا کر دُعا کرنے لگی، میرا سر سجدے میں تھا، عرض کر رہی تھی، مجھے صبر کی توفیق عطا فرما دی جائے، اور ان یتیم بچوں کی پرورش کا نظم فرما دیا جائے، دیر تک سجدے میں پڑی پڑی اسی قسم کی دُعائیں کرتی رہی، اسی حال میں مجھے نیند آگئی، خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک حسین و جمیل سرزمین میرے سامنے ہے، جس میں کہیں کہیں پتھر کے ٹکڑے بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں، اور میں اپنے شوہر کو اسی سرزمین میں تلاش کر رہی ہوں، ایک شخص نے پکار کر مجھ سے پوچھا کہ تو کیا چاہتی ہے؟ میں نے کہا کہ اپنے شوہر سے ملنا چاہتی ہوں۔ پکارنے والے نے کہا کہ داہنی جانب جو راستہ گیا ہے، اس پر چلی جا، میں اُسی راستہ پر پڑ گئی، چلتی رہی، اچانک میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھری نرم زمین میرے سامنے ہے، سبزہ زاروں سے بھری ہوئی ہے، اور بڑے بڑے اونچے محل، قصور، اِدھر اُدھر اسی سبزہ زار میں پھیلے ہوئے ہیں، میں صحیح طور پر اُن مکانوں کی حُسن و خُوبی کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی، میں نے دیکھا کہ اسی سرزمین میں نہریں بھی جاری ہیں، مگر عجب طریقہ سے یعنی نالیوں کے بغیر نہروں کا پانی بہہ رہا تھا، یوں ہی میں سیر کرتی ہوئی بڑھتی چلی جا رہی تھی، کہ میری گذر انسانوں کے ایک مجمع پر ہوئی، لوگ حلقے باندھے مختلف ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے تھے، ہر ایک ان میں سبز کپڑے پہنے ہوئے تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کا نُور احاطہ کئے ہوئے ہے،

میں نے غور سے جب دیکھا تو محسوس ہوا کہ یہ تو وہی لوگ ہیں جو گذشتہ معرکہ میں شہید ہوئے تھے، اور مختلف خوانوں پر بیٹھے ہوئے اس وقت وہی لوگ کھا رہے ہیں۔ میں اُن لوگوں کے مجمع میں داخل ہو گئی، اور ڈھونڈھنے لگی کہ میرے خاوند جو اسی معرکہ میں شہید ہوئے وہ بھی ان میں ہیں یا نہیں؟ میں تلاش ہی کر رہی تھی کہ اچانک

رحمت! رحمت!

کی آواز میرے کانوں میں آئی، جیسے مجھے کوئی پکار رہا ہے،

اسی آواز کی طرف میں پلٹ پڑی، کیا دیکھتی ہوں کہ وہی یعنی میرے خاوند مجھے پکار رہے تھے، اور میں ان کے پاس پہنچ گئی، جیسے دوسرے شہیدوں کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا، اسی طرح میرے شوہر کا چہرہ بھی تھا، میں نے پایا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ وہ بھی کھانے ہی میں مشغول ہیں، یہ ان کے وہی رفقار تھے جو ان کے ساتھ اسی دن شہید ہوئے تھے۔

میرے شوہر نے مجھے دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ بے چاری بھوکی ہے، کیا آپ لوگ اس کی اجازت دے سکتے ہیں کہ:۔

"ہم لوگ جو کچھ کھا رہے ہیں اس میں سے کچھ حصہ اس کو بھی میں دے دوں؟"

ان کے رفقاء نے اجازت دی، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا میرے شوہر نے مجھے عطا کیا۔

روٹی کا یہ ٹکڑا جو انہوں نے مجھے دیا تھا، بظاہر دیکھنے میں تو وہ اسی قسم کا ٹکڑا تھا جیسے ہمارے یہاں کی عام روٹیوں کا ہوتا ہے، لیکن میں کہہ نہیں سکتی، روٹی کے اس ٹکڑے کا رنگ کیسا تھا، برف اور دودھ سے زیادہ سفید، اور جب میں نے توڑ کر اس کو منہ میں ڈالا، تو معلوم ہوا کہ شہد و شکر سے بھی زیادہ میٹھا ہے، چھونے میں مکھن اور گھی سے بھی زیادہ نرم اور لطیف تھا۔

بہر حال اس ٹکڑے کو میں کھا گئی، جب لقمہ فرو ہو گیا، تو میرے خاوند نے کہا کہ:۔

"جاؤ، اب آئندہ کھانے اور پینے کی ضرورت سے جیتے جی تو بے نیاز ہو گئی"

وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی، اور میں جاگ اٹھی، میں نے محسوس کیا، کہ میں سیر ہوں، پیٹ بھرا ہوا ہے، اس دن سے آج کے دن تک یہ واقعہ ہے کہ نہ کھانے ہی کی ضرورت مجھے محسوس ہوئی اور نہ پینے کی۔

ابوالعباس جن سے عورت اس قصہ کو بیان کر رہی تھی، وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے، کہ ہم لوگ کھاتے پیتے رہتے، اور یہ عورت اگر اس وقت سامنے ہوتی، تو ہم لوگوں کے سامنے سے ہٹ جاتی، اور اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیتی، کہا کرتی تھی، کہ تم لوگوں کے کھانے کی بو سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

روایت کے بھی راوی ابوالعباس کہتے ہیں کہ میں نے اس عورت سے پوچھا کہ پانی نہ سہی تم نے اس عرصہ میں کسی قسم کا شربت پانی کے سوا کبھی استعمال کیا، اس نے نفی میں جواب دیا۔ پوچھنے پر اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ:۔

اس دن سے حاجات ضروری سے وہ بے نیاز ہے، کسی قسم کا احساس اس کو پیدا ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا بھی پتہ چلا کہ اس دن سے عورتوں کے "ایام ضروری" کے قانون سے بھی اپنے آپ کو مستثنیٰ پاتی ہے، بلکہ وہی ابوالعباس کہتے ہیں، کہ ایک دفعہ ذرا زیادہ بے تکلف پا کر میں نے اس عورت سے یہ بھی دریافت کیا کہ زن و شو کے تعلقات کے سلسلہ میں بھی کبھی کسی قسم کا احساس تم میں پیدا ہوتا ہے، جس پر وہ بگڑ کر بولی کہ:۔

"تم کو شرم نہیں آتی اس قسم کی بات مجھ سے پوچھتے ہو۔"

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ صرف مسئلہ کی تحقیق کے لئے مجھ سے یہ بے جا جسارت ہوئی، تب جواب میں اس نے کہا:

"ہاں! اس کی بھی ضرورت مجھے اس کے بعد کبھی محسوس نہ ہوئی"

ابوالعباس نے کہا کہ تم کو نیند آتی ہے؟ بولی کہ ہاں، خوب سوتی ہوں اور کافی گہری میٹھی نیند مجھے آتی ہے، میں نے کہا کہ نیند میں کچھ دیکھتی بھی ہو۔ بولی کہ وہی جو تم کے خواب جیسے سب دیکھتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آخر کھانا، پینا چھوڑے ہوئے اتنا

زمانہ گزر گیا تمہیں کسی قسم کا ضعف اور ناتوانی کا بھی احساس ہوتا ہے؟ جواب میں اس نے کہا کہ بھوک کی تکلیف مجھے روٹی کے اس ٹکڑے کے کھا لینے کے بعد کبھی محسوس نہ ہوئی۔

ابوالعباس کہتے ہیں کہ لوگ اس عورت کے ساتھ کچھ سلوک جو کرتے تھے تو اس کو قبول کر لیتی تھی۔ میں نے پوچھا بھی کہ تم کو لوگوں سے جو کچھ مل جاتا ہے اس کو کس کام میں صرف کرتی ہو؟ بولی کہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے کپڑے بنواتی ہوں، میں نے دریافت کیا کہ تمہیں کیا سردی اور گرمی کا احساس بھی ہوتا ہے؟ بولی ہاں! میں نے کہا کہ تم جب چلتی پھرتی ہو تو تم تھکتی بھی ہو؟ بولی کیوں نہیں آخر میں آدمی ہی تو ہوں۔ میں نے کہا کہ نماز کے لئے تم وضو بھی کرتی ہو؟ کہا کہ ہاں! فقہاء نے بھی فتویٰ مجھے دیا ہے، نیند سے جب بیدار ہوتی ہوں، تو نماز کے لئے وضو کرتی ہوں۔

ابوالعباس روایت کے راوی کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اس عورت کا پیٹ بالکل پیٹھ کے برابر ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ جو عورتیں تھیں اُن میں سے کسی کو میں نے کہا کہ تم بھی دیکھو! کہ واقعہ کیا صحیح ہے؟ اس نے دیکھ کر کہا کہ ہاں! اس کا حال یہی ہے، اسی لئے جب چلنے پھرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تو اپنی کمر میں وہ کچھ باندھ لیتی ہے، تاکہ چلنے میں آسانی ہو۔

ابوالعباس کا بیان ہے، کہ اس ملاقات کے بعد میرا یہ دستور تھا کہ سال دو سال کے بعد جب کبھی "ہزار سپ" میرا آنا ہوتا تو اس عورت سے ضرور ملاقات کرتا، اور اسی مسئلہ پر گفتگو کرتا بے کم و کاست اِن ہی باتوں کو وہ دوہراتی، جن کا میں نے ذکر کیا۔

ہزار سپ میں ایک بڑے عالم عبداللہ بن عبدالرحمن الفقیہ بھی مقیم تھے، میں نے اس عورت کا ذکر جب ان سے کیا، تو فرمانے لگے کہ:۔

"میں بھی اس عورت کے متعلق یہی باتیں اس زمانے سے سُن رہا ہوں جب سے ہوش سنبھالا ہے، آج تک کوئی ایسی روایت مجھ تک نہیں پہونچی، جس سے اس کے بیان کی تردید ہوتی ہو، یا کسی نے نہیں کہا کہ اس کو کھاتے پیتے دیکھا ہے۔"

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد ۵ کے ص۳ سے ص۷ تک بعض دوسری تفصیلات[1] کے ساتھ روایت عربی میں درج کی گئی ہے، میں نے بطور تلخیص کے اسی کا ترجمہ کر دیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس قصہ کا ذکر ہمارے یہاں کی عربی و فارسی تاریخوں میں لوگوں نے کیا ہے، لیکن باوجود تلاش کے اس کا پتہ نہ چلا کہ اس عورت کا انتقال کب ہوا، اور کس حال میں ہوا؟ بیان کرنے والے بس اسی قدر بیان کرتے ہیں، کہ خواب میں روٹی کے اُس ٹکڑے کے کھا لینے کے بعد اس عورت پر وہی حالات طاری ہوئے جن کا ذکر کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ بیداری کی نہیں بلکہ خواب کی یہ بات ہے، خواب میں ملنے والی چیز کا اثر اس عورت پر جن صورتوں میں مرتب ہوا، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "بہشتی زندگی اور بہشتی پیداواروں کی نوعیت کیا ہوگی؟" انشاءاللہ موقعہ ملا تو اسی ایک مثال سے بہشتی پیداواروں کے ایک خاص پہلو پر گفتگو کی جائے گی +

---

[1] یعنی الاقطع ترکی ڈاکو جس نے ہزار سپ پر حملہ کیا تھا، اس کے حالات بیان کئے گئے ہیں کہ خوارزم پر عموماً وہ چھاپے مارا کرتا تھا اور ترکستان کے مختلف غارت پیشہ قبائل اس کے ساتھ مسلمانوں کے علاقوں پر چڑھائی کیا کرتے تھے۔ پھر مختلف زمانوں میں جو معرکے اسی الاقطع کے ساتھ پیش آئے، اُن میں بعضوں کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی کہ عموماً یہ حملہ ان ہی دنوں میں کیا کرتا تھا، جب جیحوں کا پانی جم جاتا تھا، اور بجائے کشتی کے لوگ پیدل یا گھوڑوں، خچروں چھکڑوں پر اس دریا کو عبور کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یہ لڑائی پیش آئی، جس میں اس عورت کا شوہر شہید ہوا، میں نے ان غیر ضروری تفصیلات کو قلم انداز کر دیا ہے + (گیلانی)

قسط نمبر ۲ :۔

بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک

(حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی)

شہر ہزار سپ (خوارزم) کی اسلامی خاتون رحمت بی کے جس خواب، اور خواب کے بعد جن آثار و نتائج کا تجربہ اسی خاتون کو زندگی بھر ہوا، اس کا تفصیلی قصہ تو مؤرخین اور بعض معتبر محدثین کے حوالہ سے عرض کر چکا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تیسری صدی ہجری کے اس تجربی مشاہدہ سے بہشتی نعمتوں کے متعلق چند خصوصیات کا جو پتہ، چلتا ہے، اُن کے بعض گوشوں کو بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دوں :۔

(۱)

پہلی بات جس کا تذکرہ رحمت بی بی کرتی تھیں، وہ یہ تھی کہ کھانے کو جو چیز مجھے ملی تھی، دیکھنے میں تو وہ روٹی کا ٹکڑا معلوم ہوتی تھی، لیکن روٹی کا یہ ٹکڑا برف سے زیادہ شفاف، دودھ سے زیادہ سفید، اور شہد و شکر سے زیادہ شیریں، مکھن اور گھی سے زیادہ لطیف و نرم تھا۔

کیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ تھا؟ قرآن میں بہشتی نعمتوں کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا گیا ہے، آپ نے کبھی ان پر غور فرمایا؟ دیکھئے سورۂ الدہر میں اُن بوتلوں کا ذکر کرتے ہوئے جنہیں بہشتی لوگ استعمال کریں گے، فرمایا گیا ہے کہ :۔

"قواریر من فضّة"

ہوں گی، قواریر، قارورہ کی جمع ہے۔ شیشہ کو عربی زبان میں قارورہ، بھی کہتے ہیں۔ اور فضّہ کا ترجمہ چاندی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بوتلیں شیشہ کی اگر ہوں گی، تو پھر چاندی کی طرف اُن کو مضاف کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، اور چاندی کی ہونگی، تو پھر "قواریر" یعنی شیشہ ہونے کا کیا مطلب ہوگا۔ مگر یہ کلیہ اگر پیش نظر ہو۔ کہ موجودہ عبوری زندگی، جسے قرآنی الفاظ کے پیش نظر ہم :۔

"ابتلائی زندگی"

کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

ابتلاء و امتحان کی اس زندگی میں جو چیزیں بھی ہمیں ملی ہیں، اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، کہ اُن میں ہر وہ چیز جس میں بھلائی اور خیر کا پہلو ہے، اسی میں بُرائی یا شر کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو معلوم ہوتا ہے کہ چھپا دیا گیا ہے۔ زندگی ہی کو دیکھئے جس سے احساس و ادراک کا تعلق ہے، اور احساس ہی کی وجہ سے اُن چیزوں کو ہم پسند کرتے ہیں، جن سے راحت و مسرت حاصل ہوتی ہے، اور اذیت، دُکھ، تکلیف کا دار مدار بھی اسی احساس پر ہے، احساس و ادراک کی قوت نہ ہو تو نہ ہمارے لئے یہاں کی کوئی چیز بُری ہی باقی رہتی ہے اور نہ بھلی، بہر حال خود اسی زندگی کو دیکھئے جس پر ساری راحتوں کا دار مدار ہے اسی کے گلے میں موت کا طوق بھی پڑا ہوا ہے۔ صحت کی نعمت بھی یہاں ملی ہے لیکن صحت کا دامن مرض کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے

ہم کھاتے ہیں، کھانے میں لذت بھی ملتی ہے لیکن اسی کے ساتھ قضاءِ حاجت کی تیغ بھی لگی ہوئی ہے۔ جوانی اور شباب کے پیچھے پیچھے بڑھاپا اور پیرانہ سالی کی مصیبتیں دبے پاؤں اِن ساری لذتوں کو ترش کرتے ہوئے ہم پر مسلط

ہو جاتی ہیں، جن سے جوانی میں ہم مسرت اندوز ہوتے ہیں۔ الغرض اس دنیا میں سوچنے والوں نے جہاں تک غور کیا ہے، مطلق خیر، یا مطلق شر یعنی ایسی چیز جو ہر لحاظ اور ہر پہلو کے اعتبار سے بھلی ہی بھلی ہو، یا صرف بری، اور خراب ہو، نہیں مل سکتی۔

کسی بزرگ نے تو ایک دفعہ فرمایا کہ الدین یا مذہب، دنیا کی اس زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ لیکن چونکہ اس دنیا کی ہر چیز میں آفت کا کوئی نہ کوئی پہلو رکھ ہی دیا گیا ہے، فرماتے تھے شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ تقدیر کا مسئلہ دین ہی کا ایسا مسئلہ ہے، جس کی وجہ سے خدا ہی جانتا ہے کتنے گمراہ ہوئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ابتلائی زندگی جس میں امتحان دینے کے لئے ہم شریک کئے گئے ہیں۔ اس میں امتحان و ابتلاء کی ایک صورت تقدیر کے مسئلہ کی وجہ سے ناسمجھوں کے لئے نکل آئی ہے۔

بہرحال موجودہ زندگی میں خیر اور شر یعنی بھلائی اور برائی دونوں ہی کے مزوں کے چکھنے کے مواقع قدرت نے مہیا کر دئے ہیں، سکھ کو بھی یہاں ہم محسوس کرتے ہیں اور دکھ کو بھی، ہمارا دماغ اس کو بھی سوچتا رہتا ہے کہ ایسی زندگی کا بھی کیا امکان ہے جس میں دکھ اور کوفت اور اذیت کا کوئی کانٹا نہ ہو، سکھ ہی سکھ، اور چین ہی چین، مسرت ہی مسرت کے سوا، ایسا کوئی سوراخ باقی نہ رہے جس سے دکھ اور تکلیف کی لہریں گذر گذر کر ہمیں اور ہمارے احساسات پر چوٹ لگاتی ہیں۔ ایک طبقہ ہے جو اکتشافات و ایجادات کی راہوں سے ایسی عبوری زندگی میں کوشش کر رہا ہے کہ دکھ کی راہوں کو آدم کی اولاد پر بند کر دیا جائے۔ ایک ایسی زندگی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی جائے جس کا موت کی تلخی سے تعلق باقی نہ رہے۔ ایسی بقا میسر ہو، جس کے بعد "فنا" کا لفظ انسانی لغت سے خارج ہو جائے۔ مرض کے سارے ابواب جس پر بند ہوں اسی "صحت" کا ماحول دنیا میں پیدا کیا جائے، جو بڑھاپے اور پیرانہ سری کے حملوں سے انسانیت کا شباب محفوظ ہو جائے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے کوشش کرنے والے اس راہ میں کوشش کرتے چلے آئے ہیں۔ خصوصاً موجودہ مغربی تمدن کے استیلاء کے بعد اس راہ کی سرگرمیاں حد سے زیادہ تیز بلکہ تیز تر ہو گئی ہیں۔ صاف لفظوں میں نہ سہی لیکن چشم و ابرو کے اشاروں سے کچھ ایسے وعدے دنیا میں پھیلائے جا رہے ہیں کہ آج نہیں تو کل دکھ کے سارے کانٹوں سے دنیا کو صاف کرنے میں لوگ کامیاب ہو جائیں گے اگرچہ صحیح طور پر نہ اسی کا پتہ چلتا ہے کہ اس وعدے کے پیش کرنے والے کون لوگ ہیں، اور وعدے جو کئے جا رہے ہیں، ان کی بنیاد کیا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ "آج" نہ سہی "کل" جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ دنیا "شر" اور برائی کے سارے عناصر سے پاک ہو جائے گی، یہ "کل" یا آنے والا "فردا" ہی جب نگاہوں کے سامنے نہیں ہے، تو اس "کل" میں جو واقعات پیش آئیں گے، ان کے مشاہدے یا تجربے کا بھلا کوئی کیا وعدہ کر سکتا ہے؟ اگر موہومانہ امید اور جھوٹی طفل تسلی اس کو نہ بھی قرار دیں، جب بھی ایک خیال، صرف خیال، یا خود آفریدہ خود ساختہ خیال سے زیادہ "کل" کے یہ امکانات اس وقت تک تو اور کچھ نہیں ہیں؟ کم از کم "کل" کے اس ان دیکھے وعدے میں آج کی دنیا میں جی جی کر مرنے والوں کے لئے تو تسلی کا قطعاً کوئی سامان نہیں ہے۔ ہاں! اس کے مقابلہ میں ایک سلسلہ وہ بھی ہے، جس میں صاف صاف کھلے کھلے الفاظ میں ہر زمانہ کے برگزیدہ ترین منتخبین جانے پہچانے افراد، جن کی زندگی کا ہر شعبہ اعتماد و وثوق کی ساری منطقی خصوصیتوں سے لبریز و معمور رہا ہے۔ اور جس لحاظ سے بھی ان کو دیکھا جائے، بھروسہ کی شعاعوں سے ان کی زندگی کا ہر پہلو جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے، اصطلاحاً ہم جنہیں الرسل الانبیاء علیہم السلام کے نام سے

موسوم کرتے ہیں، جو دُنیا کے تمام سچے مذاہب کے پیشواؤں کی عام تعبیر ہے، اِسی طبقہ کی طرف سے یہی بات کہ انسانی زندگی بہرحال ایک ایسے ماحول تک پہونچکر رہے گی، جس میں سُکھ اور دُکھ کے ان قصتوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر الگ الگ کر دیا جائے گا، یعنی سُکھ اور چَین کی ایسی مسرتوں کا بھی تجربہ ہوگا، جن پر دُکھ اور تکلیف کی ساری راہیں بند ہوں گی۔ اور اسی کے بالمقابل دُکھ، اذیت، کوفت سے بھری ہوئی ایسی زندگی بھی سامنے آئے گی، جس میں کوئی سکھ کا تصور بھی کرنا چاہے گا، تو اپنے آپ کو اِس تصور سے بھی معذور پائے گا۔

"الجنۃ والنار" بہشت و دوزخ "سرگ نرکھ" کے مذہبی اور دینی الفاظ، دُنیا کے سارے مذاہب، و ادیان کے ان متعین اور مشخص وعدوں[لہ] کی تعبیریں ہیں، جن میں یہی اطلاع دی گئی ہے کہ آنے والی نسلوں میں سے کسی خاص نسل ہی کو نہیں، بلکہ ہر وہ شخص جو آدمی بن کر خاکی زندگی کے عبوری دور میں شریک ہوا ہے وہ یا تو بھلائی کے ایسے ماحول سے دوچار ہوگا جس میں بُرائی کا کوئی شائبہ اور دُکھ یا تکلیف کی کوئی پھانس نہ ہوگی۔ یا اسی کے قطعاً برعکس ایسی زندگی سامنے آئے گی، جس میں:- بُرائی کے سوا بھلائی اور خیر کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔

الغرض ہر مُلک اور ہر قوم و اُمت میں بغیر کسی استثنا کے مسلسل منادی کرنے والے یہ سُناتے چلے آئے ہیں کہ، تحلیل و تجزیہ کا قدرتی قانون بہرحال خیر کو شر سے جُدا اور قطعاً جُدا کر کے انسانیت کے سامنے لاکر رہے گا۔ چکھنے کے بعد جن لوگوں نے خیر و شر کے اس آمیزہ یا معجون مرکب سے یعنی دُنیاوی زندگی کے موجودہ عبوری دور میں اپنے لئے جس پہلو کا بھی انتخاب کرلیا ہے۔ اِسی کو تحلیلی قالب میں اپنے آگے پائینگے سُکھ اور جن چیزوں سے سکھ حاصل ہوتا ہے، جنھوں نے اس کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے سامنے دکھ اور دکھ کے ہر پہلو سے علیحدہ ہوکر سکھ ہی سکھ آجائے گا، یہی جنتی اور بہشتی لوگ ہیں، اور جنھوں نے اپنے طریقۂ عمل سے دُکھ اور دُکھ کے پیدا کرنے والے اسباب کو چُن لیا ہے۔ سُکھ اور چین سے پھٹ کر اُن کے آگے دُکھ ہی دُکھ اپنے خالص رنگ میں آجائے گا، دُکھ کا ایسا خالص بے میل رنگ جس میں کوئی جہت کسی حیثیت سے سُکھ یا راحت و آرام کی نہ ہوگی۔

بات بہت طویل ہوگئی، گفتگو "قواریر من فضۃ" (شیشے چاندی سے) ان ہی قرآنی الفاظ کے متعلق ہو رہی تھی کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خیر مطلق و خالص کا نام جب الجنۃ ہے اور "مطلق شر" یا "خالص بُرائی" کی مذہبی تعبیر "النار" کے لفظ سے کی گئی ہے، اور موجودہ خاکی زندگی، کے قوام ہی میں خیر کے ساتھ شر، بھلائی کے ساتھ بُرائی گھُلی ملی ہوئی ہے، اور اب سمجھئے کہ بہشتی بوتلوں کی کس خصوصیت کی طرف "قواریر من فضۃ" کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ شیشہ جو دُنیا میں پایا جاتا ہے وہ اپنے اندر ایک مرغوب و پسندیدہ صفت رکھتا ہے، لیکن تابانی و درخشانی چمک دمک کی صفت سے دُنیا کا یہ شیشہ محروم ہے، اِسی طرح دُنیا کی چاندی میں چمک دمک کا کمال پایا جاتا ہے، لیکن شیشہ کا کمال یعنی شفاف ہونا، ہم دُنیا کی چاندی میں اس کمال کو نہیں پاتے جنّت میں ان ہی دونوں کی کمالی صفات سے ترکیب دیکر قُدرت ایک ایسے جدید عنصر کو تیار کرکے پیش کرے گی، جو شیشے اور چاندی کے کمالات سے بھی موصوف ہوگا، اور

[لہ] صرف یہودیوں کی آسمانی کتاب "تورات" سے اس وعدے کو نکالنے والوں نے خُدا ہی جانتا ہے کس طرح نکال دیا ہے۔ تاہم یہودیوں کی اکثریت میں اس عقیدے کا اثر پایا گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے ویدک دہرم کی عام کتابیں مہابھارت اور رامائن، گیتا، بھی اسی کے تذکرہ سے بھری ہوئی ہیں، حد یہ ہے کہ بودھ مت، جس مت کی طرف منسوب کرنے والے یہ عقیدہ تو منسوب کرتے ہیں کہ "خدا کا ذکر ان مذاہب میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن الجنۃ والنار" کے متعلق تفصیلی بیانات ان مذاہب میں بھی ملتے ہیں۔ ۱۲ منہ

اِن نقائص سے بھی یہ جدید بہشتی عنصر پاک ہوگا، جن کو ہم دُنیا کی چاندی اور شیشے میں پاتے ہیں۔ "قواریر من فضة" کے الفاظ سے اگر یہ مطلب سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ بہشتی پیالوں کی یہی خصوصیت بھی ہوتی ہے، اور بہشت کی بوتلیں ہی کیا آپ قرآن کھول کر پڑھتے جائیں۔ آپ کو "الجنة" کے تذکروں میں مسلسل اِس قسم کی باتیں ملتی چلی جائیں گی مثلاً "بہشتی مشروب" کے متعلق "کاس من معین" (ستھری شراب) کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

لا یصدعون عنہا ولا ینزفون (الواقعہ) — "نہ درد سر اس سے ہو، اور نہ اس کو پی کر وہ بہکیں گے"

یا دُنیا کا ایسا خار دار درخت جیسے بیری کے درخت ہوتے ہیں، بہشتی خطہ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ بھی:۔

سدر مخضود — "کانٹوں سے پاک بیری"

کے درخت کی شکل اختیار کرلیں گے، یا دُنیا کے پھل لانے والے درختوں کا عام قاعدہ جو یہ ہے کہ خاص خاص موسموں ہی میں وہ پھلتے ہیں، ہر موسم میں اِسی لئے میسّر نہیں آتے، خبر دی گئی ہے کہ بہشتی سرزمین میں اُن کا حال یہ باقی نہ رہے گا، بلکہ:۔

لا مقطوعة ولا ممنوعة (سورۂ واقعہ) — "کسی خاص موسم میں وہ نہ ختم ہوں گے (اِسی لئے ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ان کا سلسلہ) رُک جائے"

اِسی سلسلہ میں "بہشتی موسم" اور "ماحول" کا ذکر ان الفاظ میں جو کیا گیا ہے کہ:۔

ظل ممدود — "بڑی لمبی چھاؤں ہوگی"

اِسی کو قرآن ہی کے الفاظ میں دیکھئے:۔

لا یرون فیہا شمسا ولا زمہریرا (واقعہ) — "اور بہشت کے آباد کار نہ دیکھیں گے وہاں دھوپ اور نہ پالا"

حاصل جس کا یہی ہے کہ دُنیا کے موسمی ماحول میں رہنے والے جن چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں، ان سے بہشت کا موسم، اور اس کا ماحول قطعی طور پر صاف اور پاک ہوگا۔

بطور مثال کے چند چیزوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے، قرآن پڑھنے والوں کی توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ان جزئیات کو جزئیات کی حقیقت سے نہیں بلکہ ایک "کلی قانون" کے انفرادی مظاہر کے نقطۂ نظر سے چاہئے، کہ اُن کا مطالعہ کیا جائے۔ فطرت انسانی کی سب سے زیادہ محبوب و مرغوب حقیقت یعنی "مرد اور عورت" کے تعلقات، کے سلسلہ میں آپ پائیں گے۔ قرآن کی بہشتی زندگی میں ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ لیکن بہشت کے جوڑے (ازواج)، کو آپ دیکھیں گے "مطہرہ" کی صفت سے قرآن ان کو موصوف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دُنیا میں حسین سے حسین جوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔ شاعر نظم میں ہو، یا نثر میں، ان کی یقیناً یک رُخی تصویر کھینچتے ہیں، وہ صرف ان کے لب نوشیں کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن کھانے پینے کے بعد جب سونے والے سو کر اُٹھتے ہیں، معدے سے اُٹھنے والے بخارات اور بھپارے ان ہی انسانی ازواج یا جوڑوں کے مُنہ کو جن ناقابل برداشت آلودگیوں سے بھر دیتے ہیں، دانتوں اور اُن کے درمیانی درازوں میں جو گندگیاں جمع ہو جاتی ہیں وہی گندگیاں جن کے ازالہ پر ہر سال آدمی کی کمائی ہوئی آمدنیوں کی کافی مقدار ٹوتھ پوڈر، ٹوتھ برش، اور خدا جانے کن کن ناموں پر بہائی جاتی ہے ذرا ان کا تصوّر کیجئے۔ غریزی حرارت مسامات کی راہوں سے جن بدبو، پسینوں اور آلائشوں، میل کچیل کو باہر پھینکتی رہتی ہو بدن کے خاص خاص گوشوں (بغل، بن ران وغیرہ) میں جو انبار جمع ہوتا رہتا ہے، ذرا ان کو سوچئے، اور اسی کے ساتھ جسم کی دوسری دافعہ قوتوں کے ردّعمل کے آثار و نتائج کو پیش نظر رکھئے، تو اس میں کیا کوئی شک کرسکتا ہے کہ ہمارے سارے شاعر خواہ کسی زبان کے ہوں، اپنی صرف ایک آنکھ کھلی

رکھتے ہیں، وہ الغاوٗون (راہ سے بھٹکے ہوئے) لوگوں کو زیادہ گمراہ کرتے ہیں، اگرچہ ان ہی کانے شاعروں میں کبھی کبھی دو آنکھوں والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً امیر مینائی مرحوم کا مشہور شعر ہے

چھیڑتے کیوں ہو جوانی میں حسینوں کو امیر
رات ہی بھر کا یہ جوبن ہے سحر ہونے دو

کالے بال جب سفید چونڈوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، موتی کی طرح چمکنے والے دانت اپنی رونق و بہار کو کھو کر گرتے چلے جاتے ہیں، کسے کسائے بھرے بھرائے اعضا جب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، جھریاں جب لٹک آتی ہیں، جس دنیا کے چند ہی دنوں کے ہیر پھیر میں لپٹ کر "رات بھر کا جوبن" سحر کے اس قالب میں ڈھل جاتا ہو، اور ڈھلتا ہی چلا جاتا ہو "خیر و شر"۔ "بھلائی اور برائی" کے اس آمیزہ کو سامنے رکھ کر قرآن کے "ازواجِ مطہرہ" کا مطلب سمجھئے تب آپ کو اندازہ ہو گا کہ بہشتی جوڑوں، یا "جنتی ازواج" سے کیا مراد ہے۔[1]

قرآن کے اسی کلی نقطۂ نظر کی تشریح صحیح حدیث کے ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ:۔

ینادی منادان لکم ان تصحوا فلا تسقموا ابدا، وان لکم ان تحیوا فلا تموتوا ابدا، وان لکم ان تشبوا فلا تھرموا ابدا، وان لکم ان تنعموا فلا تبأسوا ابدا۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

"(بہشت میں) پکارنے والا پکاریگا کہ لیے بہشت والو! تم اب ہمیشہ تندرست ہی رہو گے کبھی بیمار نہ پڑو گے اب تم اس میں ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، تم اس میں اب جوان ہی رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے، اور یہ کہ سکھ ہی سکھ میں رہو گے، دکھ کو کبھی نہ پاؤ گے"

⁂　⁂　⁂　⁂

بخاری میں ہے کہ بہشت کے آبادکاروں کی خصوصیت یہ ہو گی کہ:۔

لا یسقمون، ولا یتغوطون ولا یتفلون ولا یمتخطون (صحیح بخاری)

"وے کبھی بیمار نہ پڑیں گے، نہ قضاء حاجت کریں گے، تھوک اور بلغم پھینکنے کی بھی ضرورت ان کو نہ ہو گی"

اور جو حال "خیرِ مطلق" کے اس "مظہرِ اتم" یا "تشکیلی قالب" "الجنۃ" کا ہے، کچھ یہی حال "شرِ مطلق" والی دنیا یعنی جہنم کا بھی ہے، جیسے خدا کی بہشتی قلمرو میں "شر" کا کوئی کانٹا نہ ہو گا، اسی طرح جہنم "خیر" اور "بھلائی" کے نام سے بھی ناآشنا ہو گی۔

حد یہ ہے کہ "النار" یعنی "آگ" کے لفظ کو سنکر خیال ہوتا ہے، کہ سرخ سرخ شعلوں، اور لال لال انگاروں سے گویا جہنم بھری ہو گی۔ مگر مشکوٰۃ ہی کی یہ روایت لوگوں کے سامنے اگر ہو، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے کہ:۔

اوقد علی النار الف سنۃ　　"سلگائی گئی جہنم ہزار سال

[1] انجیل میں ہے کوئی یہودی فقیہ جو یہودیوں کے صدوقی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا بعث بعد الموت (مرنے کے بعد جی اٹھنے کے) عقیدے کے منکر تھے اسی منکرِ آخرت یہودی نے حضرت مسیح علیہ السلام سے اس عورت کے متعلق دریافت کیا جس کی دنیا میں متعدد شوہروں سے عقد کیے بعد دیگرے مرجانے کی وجہ سے ہوا، جنت میں یہی عورت کس شوہر کو ملے گی، تو جواب میں لکھا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "جب لوگ مردوں میں سے جی اٹھیں گے تو ان میں شادی نہ ہو گی بلکہ آسمان پر فرشتوں کی مانند ہوں گے"۔ (مرقس ۱۲ تا ۲۵) انجیل کا یہی فقرہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس سے یہ عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا کہ دوسری زندگی میں نیک آدمی کو فرشتہ اور بدکاروں کو خبیث روح بھوت وغیرہ بنا دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ فرشتوں کو کھانے پینے اور دوسرے لذائذ جن سے انسانی فطرت مسرت اندوز ہوتی ہے، ایسی باتوں سے کیا سروکار رہا گویا انسانی احساسات سے آدمی کو جنت میں محروم کر دیا جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کی بہشتی زندگی آدمی کے لئے سزا کی شکل ہی یا جزا کی۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی عیسائی اس دنیا میں بھی اس قسم کے بہشتی آدمی کی شکل اختیار کرنے پر تیار ہو سکتا ہے۔ قرآن کا کلیہ یہی ہے کہ آدمی زندگی کے ہر دور میں آدمی ہی رہتا ہے، دنیا میں بھی، جنت میں بھی مم

مم جہنم میں بھی۔ اسی زمانہ میں عیسائیوں کے اسی عقیدے کو "روحانی جنت" کی تعبیر سے ادا کر کے سمجھایا جاتا ہے کہ گویا کوئی یہی سائنس یا فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ تفصیل میری کتاب الدین القیم میں ہے ۔۱۲ (گیلانی)

حتی احمرت، ثم اوقد علیھا الف سنۃ حتی ابیضت ثم اوقد علیھا الف سنۃ حتی اسودت۔ (مشکوٰۃ)

یہاں تک کہ وہ لال ہوگئی، پھر سُلگائی گئی ہزار سال تاآنکہ وہ سفید ہوگئی، پھر سُلگائی گئی ہزار سال تاآنکہ وہ سیاہ ہوکر رہ گئی۔"

آخر میں "جہنم" اور جہنم کے ماحول کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے :۔

فھی سوداء مظلمۃ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

"وہ صرف کالی، اور تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

جہنم کے متعلق قرآن میں :۔

ظل من یحموم۔ (واقعہ) "سایہ دھوئیں کا"

یا :۔ "المرسلات" میں :۔

ظل ثلث شعب "سایہ تین شاخوں والا"

وغیرہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں، مذکورہ بالا حدیث سے ہم ان کے مطلب کو سمجھ سکتے ہیں، جہنمی دھواں جس سے یہ "ناری خطہ" بھرا رہے گا، جب دُھواں ہی دُھواں ہوگا، تو اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ وہاں روشنی کی کوئی کرن نہ پائی جائے گی، تاریکی ہی تاریکی ہوگی۔ ثلث شعب (تین شاخوں) سے بعضوں کا ذہن جو ادھر منتقل ہوا ہے، کہ اس کے طول و عرض و عمق، تینوں جہات میں ظل ہی ظل ہوگا، تو حاصل یہی ہوا کہ نور اور روشنی سے کسی قسم کا کوئی سروکار جہنم کو نہ ہوگا، آخر عدم النور ہی کی تعبیر تو ظل، یا سایہ ہے۔

اور یہ تو جہنمی اقلیم کے ماحول کا رنگ قرآن کی رو سے ہوگا، باقی جہنمی پیداواروں کے متعلق اسی قرآن میں اس قسم کے الفاظ جو ملتے ہیں، مثلاً ایک جہنمی نبات کا نام "ضریع" بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ :۔

لا یسمن ولا یغنی من جوع۔ (الغاشیہ)

"نہ فربہی اس سے حاصل ہو، اور نہ بھوک کے ازالہ میں اس سے مدد ملے۔"

٭ ٭ ٭

پہلی بات تو سوچنے کی یہی ہے کہ دُنیا کی آگ جہاں اچھی چیزوں کے جلانے کی صلاحیت رکھتی ہے وہیں بُری چیزوں کو بھی اُس میں جھونک دیجیے۔ تو جلا کر راکھ کردے گی، لیکن جہنم حالانکہ حرارت ہی حرارت ہوگی، مگر جہنمی نباتات بجائے جلنے بھُننے کے اسی جہنمی حرارت سے نشوونما پائیں گے، جن میں ایک یہ "ضریع" بھی ہے۔ پھر دُنیا میں بدترین خاردار پودے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن کھانے والوں کی بھُوک کا تو ازالہ ان سے ہوجاتا ہے، ہضم ہوجائیں تو ان سے بدل ما یتحلل کا کام بھی چلتا ہے، یعنی حرارت غریزی سے فنا ہونے والے اجزاء کی جگہ نئے اجزاء ان سے پیدا ہوجاتے ہیں تھوہڑ یا ناگ پھنی (چیل سینڈھ) جیسے خاردار نباتات کے متعلق بھی عام تجربہ یہی ہے۔ لیکن خیر اور بھلائی کے اس پہلو سے بھی جہنمی نباتات خالی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو، تو جہنم کو "شر مطلق" کہنے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔

رحمت بی بی بے چاری جسے بہشت کی روٹی کے صرف ایک ٹکڑے کا اور وہ بھی خواب میں تجربہ کرایا گیا تھا۔ لیکن باوجود اس کے تاثر اور اس کی تعبیر اسی اسلامی خاتون کی کتنی دلچسپ اور عجیب ہے۔ درحقیقت وہ یہی کہنا چاہتی تھی کہ دنیا کی اچھی سے اچھی چیزوں میں بھی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں، ان ساری خوبیوں سے "بہشتی نان" کا یہ ٹکڑا موصوف تھا، جو مجھے کھلایا گیا تھا، اور جو کوتاہیاں خیر و شر کے اس مجموعہ مرکب دُنیا کی چیزوں میں پائی جاتی ہیں، ان کوتاہیوں اور نقائص سے یہ ٹکڑا روٹی کا پاک تھا، اسی دعا کو رحمت بی نے ان الفاظ میں ادا کیا کہ :۔

"وہ برف سے زیادہ شفاف، دُودھ سے زیادہ سفید، اور شہد و شکر سے زیادہ شیریں، مکھن اور گھی سے زیادہ نرم اور لطیف تھا۔"

(باقی)

قسط نمبر (۳):۔

بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک

(حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی)

یاد ہوگا کہ رحمت بی کا بیان یہ بھی تھا کہ خواب میں بہشتی روٹی کا جو ٹکڑا اُسے کھلادیا گیا تھا اس کے بعد خورونوش کی ضرورت سے وہ بے نیاز ہوگئی تھی، مطلب جس کا وہی ہوا کہ بے چینی، کے بعد چین یا دُکھ کے بعد سکھ کے جن احساسات کا تجربہ موجودہ خاکی زندگی میں لوگوں کو عموماً ہورہا ہے پیاس کے بعد پینے میں، بھوک کے بعد کھانے میں، سردی کی تکلیف کا ازالہ دُھوپ میں بیٹھنے سے اور گرمی کے موسم میں کپڑوں کے بار سے سبکدوشی میں، ہم راحت وعافیت کی کیفیتوں کو جو محسوس کرتے ہیں، بہشتی زندگی میں اس نوعیت کے تجربوں کا خاتمہ ہوجائے گا، آخر جہاں سُکھ ہی سکھ ہو، وہاں دُکھ کی راہوں سے سُکھ کے حصول کا امکان ہی کیا باقی رہتا ہے؟

بقول شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ:۔

ان جھنم لیست مدار الشئ من الخیر کما ان الجنۃ لیست مدار لشئ من الشرور (ص ۳۷۵ ج)

"جہنم نام ہی اس خطہ کا ہے، جہاں کسی قسم کی بھلائی اور خیر کا پتہ نہ ہوگا، جیسے الجنۃ کو کسی قسم کے شر اور بُرائی سے سروکار نہ ہوگا۔"

حتی کہ اسی بُنیاد پر شیخ نے دعویٰ کیا ہے کہ دن کی روشنی، موجودہ زندگی میں رات کی تاریکی کے بعد آتی ہے لیکن:۔

فاذا کانا فی الاٰخرۃ کان اللیل فی دار جھنم والنھار فی دار الجنۃ۔ (ص ج ۱۷)

"جب زندگی، الآخرہ کے دور میں داخل ہوگی تو رات جہنمی خطہ کیلئے اور دن بہشتی علاقہ کے ساتھ مختص ہوجائے گی"

* * *

میں نے عرض بھی کیا تھا کہ "جہنم" کے متعلق آگ اور آگ کے ساتھ روشنی کی طرف عموماً لوگوں کا دھیان جو چلا جاتا ہے یہ ایک غلط ذہنی انتقال ہے، ورنہ جہنم میں تاریکی اور اندھیرے گھپ کے سوا، اور کچھ نہ ہوگا، قرآنی آیات اور نبوی ارشادات بھی اس باب میں بطور شہادت پیش کئے جاچکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ جہنمی خطہ کے اس تاریک ماحول کے ساتھ جب جہنم کے پہاڑی سلسلوں، اُن پہاڑوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہنے والے، گرم گرم کھولنے والے چشموں اور کھائیاں یا کھڈ جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں[لہ]، اُن ہی کے درمیان بھٹکنے والوں کو بھٹکنے کے لئے جب چھوڑ دیا جائے گا، تو العیاذ باللہ اُن پر کیا گذرے گی، صرف یہی نہیں کہ جہنم کی آگ "نور" اور "روشنی"، ہی کی صفت سے محروم ہوگی بلکہ حرارت اور گرمی پیدا کرنے کی ناری خاصیت کے ساتھ ساتھ عجیب بات ہے کہ جہنمی خطے کے عام نباتات جن میں بعضوں کے ناموں کی قرآن میں تصریح بھی کی گئی ہے، مثلاً ضریع اور زقوم، غسلین وغیرہ یہی جہنمی نباتات بجائے جل بھن جانے کے

لہ قرآن میں "صعود" کے لفظ سے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے جہنم کے کسی پہاڑی سلسلے کی تعبیر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت پائی جاتی ہے کہ "الصعود جبل فی النار" ابن المنذر نے ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کو منسوب کیا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ قرآن ہی میں جہنم کے عین اٰنیہ، "گرم چشمے کا ذکر سورۃ الغاشیہ میں کیا گیا ہے" سورۃ القارعہ کی آیت "امہ ھاویہ" کی تفسیر کے ذیل میں مفسرین لکھتے ہیں: المھوی والمھواۃ ما بین الجبلین یعنی دونوں پہاڑوں کے درمیان [illegible] ۱۲

جہنمی نار کی حرارت سے نشو و نما پائیں گے، بلکہ سورۂ الصافات کی ان آیتوں سے یعنی جہنم کی ایک نباتاتی پیداوار "شجرۃ الزقوم" کا تذکرہ کرتے ہوئے اطلاع دی گئی ہے کہ:۔

انها شجرة تخرج فی اصل الجحیم طلعها کانه رؤس الشیاطین ۔ (القران الحکیم)	"زقوم کا درخت ایک ایسا درخت ہے جو برآمد ہوتا ہے دوزخ کی گہرائیوں سے، ان کے برگ و بار گویا کہ شیطانوں کے سر ہیں[1]"

٭ ٭ ٭

جس سے معلوم ہوا کہ بجائے خشک ہونے بلکہ جل بھن جانے کے، جہنم کی اندرونی حرارت سے اس ناری پودے کی پرورش ہوگی، جڑ اس کی جہنم کی گہرائیوں میں ہوگی، اور برگ و بار (طلع) اس کے اسی حرارت سے نشو و نما پائیں گے، گویا دنیا کی آگ میں خوبی کا ایک پہلو جو یہ تھا کہ اچھی چیزوں کے ساتھ ضرر رساں چیزوں کو بھی وہ جلا دیتی ہے، جہنم کی آگ کی حرارت خیر کے اس پہلو سے بھی محروم ہوگی، اور یہ سب کچھ گویا تفصیل ہے اس اجمال کی کہ "جہنم" صرف شرور اور برائیوں کے مجموعہ کا نام ہے، جیسے "الجنۃ" "خیر مطلق" کی مذہبی اور دینی تعبیر ہے، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بے چینی کے ازالہ سے جو چین اور آرام آدمی کو دنیا میں میسر آتا ہے، برخلاف اس کے جنت میں انسانی احساسات کے لئے فقط راحت ہی راحت، مسرت ہی مسرت، لذت ہی لذت کے اسباب مہیا کئے جائیں گے۔ جن کا زندگی کے موجودہ عبوری دور میں کہ بڑے ہوں یا چھوٹے، شاہ ہوں، یا گدا، امیر ہوں، یا غریب، سرمایہ دار ہوں، یا نادار، یورپ میں رہتے ہوں، یا امریکہ میں، ایشیا کے باشندے ہوں، یا افریقہ کے کہیں کے ہوں، کوئی ہو، کسی حال میں ہو، اس قسم کی زندگی کا تجربہ نہیں کر سکتا۔ قرآن میں بہشتی زندگی کے سلسلہ میں ایک موقع پر یہ خبر دی گئی ہے کہ:۔

ان لك ان لا تجوع فیها ولا تعری وانك لا تظمؤ فیها ولا تضحی۔ (طٰہٰ)	"تیرے لئے اس میں یہ ہے کہ نہ بھوکا رہے تو اور نہ ننگا، اور نہ پیاسا ہوگا تو اس میں اور نہ دھوپ کھائے گا"

آپ دیکھ رہے ہیں، رحمت بی بی کے ایک ہلکے سے رویائی تجربہ سے اسی کی تصدیق ہو رہی ہے۔

رحمت بی کے اس قصے سے راوی ابو العباس کے حوالہ سے ایک مشاہدہ کا تذکرہ اسی سلسلہ میں یہ بھی کیا گیا تھا کہ کھانے کے لئے جب ابو العباس اور ان کے رفقاء دسترخوان پر بیٹھے، تو رحمت بی کو دیکھا کہ ناک پر ہاتھ رکھے ہوئے کچھ پیچھے کی طرف کھسک گئی، وجہ جب پوچھی گئی، تو جواب میں رحمت بی نے کہا کہ جو کھاتے تم لوگ کھاتے ہو، اس کی بو سے مجھے اذیت ہوتی ہے۔ رحمت بی کا یہ تجربہ بھی خاص طور پر مستحق توجہ ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "بہشتی خطے" "خیر مطلق" کے لامحدود سرمایہ سے تو معمور ہی ہوں گے۔ ان ہی سرمایوں سے جن کا تصور بھی قرآن ہی کی رو سے ہم اپنی موجودہ خاکی زندگی میں نہیں کر سکتے۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین۔	"کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لئے چھپا کر کیا رکھی گئی ہے آنکھ کی ٹھنڈک"

کی آیت کے سوا مشہور قدسی حدیث:۔

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ (صحاح)	"اپنے نیک لوگوں کے لئے مہیا کر رکھی ہے میں نے ایسی چیز جسے نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ کسی آدمی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا"

٭ گویا زقوم کے جہنمی پودے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سلسلہ اس دنیاوی کانٹے کا ملا ہوا ہے ۱۲

[1] عام ترجمہ تو "رؤس الشیاطین" کا یہی کیا جاتا ہے، لیکن زجاج وغیرہ عربی زبان کے مستند اہل لغت کا بیان ہے کہ مراد یہاں یہ ہے کہ اس درخت کی شاخوں سے جو برگ و بار برآمد ہوں گے ان کی شکل پھن دار سانپوں یعنی ناگوں کے سر کی ہوگی، شمالی ہند میں "ناگ پھنی" ایک خاص خاردار درخت کو کہتے ہیں جنوبی ہند میں اس کا نام "چپل سینڈ" ہے، واقعی معلوم ہوتا ہے کہ ناگ کے پھن اس کی شاخوں میں ٹکے ہوئے ہیں۔ تجربے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ موسم جتنا زیادہ گرم ہوتا ہے اسی حد تک ناگ پھنی کے درخت سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ م

میں اسی کی خبر دی گئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "بہشت" کے آبادکاروں اور باشندوں کے اندر بھی کوئی نئی کیفیت بہشتی بستیوں میں بس جانے کے بعد پیدا ہو گی؟

سورۃ الدھر کی آیت "قواریر من فضۃ" والی جس سے بہشتی دنیا کے ایک جدید عنصر کا سراغ لگایا گیا تھا، یعنی ایک ایسا نیا عنصر جو خاکی دنیا کے شیشے، اور چاندی کے عیوب و نقائص سے پاک ہو گا، اور جو خوبیاں شیشے اور چاندی میں علیحدہ ہو کر پائی جاتی ہیں، وہی خوبیاں اس نئے بہشتی عنصر میں جمع ہوں گی۔

بہرحال اسی آیت کے آخری الفاظ یعنی:۔

"قدروھا تقدیرا"

پر غور کیجئے۔ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ پینے پلانے کے لئے پیمانے، اور ظروف، جام وصراحی، آبگینے وگلاس وساغر جنت میں جو زیرِ استعمال ہوں گے، ان کو خود "اہلِ بہشت" اپنی اپنی خواہش، اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق جس سانچے پر بھی چاہیں گے، ڈھال ڈھال کر بنا لیا کریں گے، اگرچہ ذہنی طور پر اب بھی آدمی اپنے اندر یہ پاتا ہے کہ خیالی عالم میں جس پیمانے پر بھی چاہے چیزوں کو ڈھال سکتا ہے، پیالے، اور برتن ہی نہیں، بڑی سے بڑی عمارت کا آپ تخیل کیجئے، عالمِ خیال میں اس عمارت کو آپ اپنے سامنے کھڑی پائیں گے، چاہے وہ (ممتاز) تاج بی بی کا روضہ تاج محل ہی کیوں نہ ہو، خیالی قوت سے ذہنی مخلوقات کو پیدا کر لینے کی یہ صلاحیت انسانی فطرت میں جو پائی جاتی ہے، اصطلاحی الفاظ میں اسی کا نام بعضوں نے:۔

"کن فیکونی قوت"

رکھ چھوڑا ہے۔ کیوں کہ خیالی مخلوقات کی آفرینش کی اس ذہنی قوت سے چاہنے والے پیدا کرنے کے ارادے کے ساتھ ہی عالمِ خیال میں جس چیز کو چاہتے ہیں پیدا کر لیتے ہیں، گویا "کُن" کے ارادے کے ساتھ ہی عالمِ خیال میں وہ چیز "فیکون" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کم از کم خود پیدا کرنے والا اپنی اس خیالی مخلوق کو اپنے آگے موجود پاتا ہے، لیکن "کن فیکونی" کی یہ قوت زندگی کے موجودہ عبوری خاکی دور میں اتنی زوردار نہیں ہوتی، کہ تخیل کی قوت سے پیدا کی ہوئی چیزوں کا احساس دوسروں کو بھی کرایا جا سکتا ہو، دوسرے کیا؟ خود تخیل کی قوت سے کام لینے والے اپنے بیرونی حواس بینائی وشنوائی کی قوتوں کو بھی اپنی خیالی مخلوقات سے متاثر نہیں کر سکتے۔

رحمت بی بی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ "انسانی وجود" کی موجودہ صلاحیتوں میں بہشتی زندگی میں غیر معمولی لطافت اور ذکاوت پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے دنیاوی کھانوں کی مہک رحمت بی بی کی قوتِ شامہ کے لئے ناقابلِ برداشت بن گئی تھی، شدتِ لطافت وذکاوت، کے اسی قانون کا یہ اثر ہو گا کہ جس سانچے پر بھی اہلِ جنت چاہیں گے، پینے پلانے کے ظروف اور پیالوں کو ڈھال لیں گے، اور ان کے ڈھالے ہوئے یہ برتن صرف خیالی نہیں بلکہ واقعی ایسا وجود حاصل کر لیں گے جنھیں بہشت کی اس زندگی میں اسی طرح لوگ برتیں گے جیسے آج دنیا میں مختلف پیمانوں پر ڈھلے ڈھلائے گلاسوں اور آبگینوں کو ہم استعمال کرتے ہیں۔ اس باب میں شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"اہلِ جنت جب بہشتی بستیوں، اور آبادیوں میں آباد ہو کر بس جائیں گے، تب خدا کا ایک فرشتہ جنت کے ان آبادکاروں کے پاس آئے گا۔ اور ایک "خدائی پروانہ" ان کے حوالے کرے گا، جس میں سلام کے بعد یہ لکھا ہو گا کہ:۔

من الحی القیوم الذی لا یموت الی الحی القیوم "اس کی طرف سے جو حی وقیوم (یعنی زندہ اپنی مخلوقات کا

الذی لا یموت۔ — تھامنے والا ہے اور جو کبھی نہیں مریگا

امابعد:۔ — اس کے نام جو حی قیوم (زندہ اور اپنی مخلوقات کا تھامنے والا ہے) جو کبھی نہیں مرے گا"

امابعد

فانی اقول للشئ کن فیکون وقد جعلتک الیوم تقول للشئ کن فیکون۔ (فتوحات ص۳۸۹ ج۳)

پس میں شئی (جسے پیدا کرنا چاہتا ہوں اس سے) کہتا ہوں کہ ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے، اور آج کے دن سے یہ قاعدہ میں نے بنا دیا کہ تو بھی شئی (جس کے پیدا کرنے کا ارادہ کرے) اس سے کہیگا کہ ہوجا، تو وہ ہوجائے گی"

شیخ کا بیان ہے کہ "خدائی پروانہ" کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

فلا یقول احد من اھل الجنۃ للشی کن الا ویکون (فتوحات ج۳ ص۲۹۵)

"پس اہل بہشت میں سے جو بھی جس چیز کو کہے گا کہ ہوجا تو وہ ہوجائے گی"۔

گویا "کن فیکونی" قوت کے استعمال کا یہ لائسنس، یا اجازت نامہ ہوگا، جو بہشت کے آباد کاروں کو قدرت کی طرف سے ہمیشہ کے لئے عطا فرما دیا جائے گا۔

سچ تو یہ ہے، کہ شیخ اکبر کی مذکورہ بالا روایت اگر نہ بھی ہوتی تو ایسی قرآنی آیتیں مثلاً:۔

ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ماتدعون۔ (فمن اظلم پ۲۴)

"تمہارے لئے اس میں (یعنی جنت میں) وہ سب کچھ ہے جو تمہاری خواہش ہو، اور تمہارے لئے اس میں وہ بھی ہے جسے تم مانگو"۔

یا سورہ یٰسین میں ہے:۔

لھم فیھا فاکھۃ ولھم ما یدعون۔ (یٰسین)

"اہل جنت کے لئے میوے ہیں اور وہ سب کچھ ہے جسے وہ مانگیں"

کے اجمالی الفاظ سے بھی وہی سمجھ میں آتا ہے، جس کا ذکر اس:۔ "خدائی پروانہ"

میں کیا گیا ہے۔ فرق دونوں میں صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔

جیسا کہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ آدمی کا جی جو کچھ چاہتا ہے آج بھی خیالی عالم میں تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کرلیتا ہے۔ لیکن حسی وجود اس کو عطا نہیں کرسکتا، ایسا حسی وجود جس پر واقعی آثار مرتب ہوں، مثلاً آگ کو چاہے تو تخیل کی قوت سے ذہن میں پیدا تو کرلیتا ہے، لیکن اس آگ کا خود پیدا کرنے والے کے بیرونی احساسات سے بھی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور نہ دوسرے ہی اُسے دیکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، پکڑ سکتے ہیں، اور حرارت، روشنی وغیرہ جو آگ کے آثار و خواص ہیں، خیالی قوت سے پیدا کی ہوئی اس آگ پر یہ آثار بھی مرتب نہیں ہوتے، پھر ان ذہنی اور خیالی مخلوقات کو دیر تک اپنے ذہن کے سامنے بھی قائم اور باقی رکھنے کی قوت بھی اس وقت ہم میں نہیں ہوتی، خیالی مخلوقات ذہن ہی میں پیدا ہوتی ہیں، اور مٹتی چلی جاتی ہیں۔

لیکن بہشتی زندگی میں کن فیکونی قوت سے پیدا ہونے والی چیزوں کا رنگ یہ نہ ہوگا، وہ دیدہ مرئی، حسی وجود کے لباس میں اپنے پیدا کرنے والوں کے سامنے جلوہ گر ہونگی۔ اور ہر چیز کے جو واقعی اور حقیقی آثار و خواص ہیں، اُن کا ظہور بھی ان چیزوں سے ہوگا، اور پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جانے کی کیفیت جیسے آج خیالی مخلوقات میں ہم پاتے ہیں بہشت میں ان کا حال یہ نہ ہوگا، بلکہ قیام و بقاء کا قالب اختیار کرلیں گی۔ گویا یوں سمجھیے کہ اپنی کن فیکونی قوت سے خالق تعالےٰ جل مجدہٗ کائنات کو پیدا کرکے اپنی "قیومی" قوت سے ان کو جیسے تھامے ہوئے ہے، اور کائنات کے

قیام وبقاء میں استمرار کا رنگ خالق قیوم کی اسی "قیومی" صفت نے پیدا کر دیا ہے اپنی پیدا کی ہوئی مخلوقات کے باقی اور قائم رکھنے کی یہی "قیومی قوت" بہشت کے آباد کرنے والے بندوں کو بھی حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ارزانی فرمادی جائے گی۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے منقولہ بالا "خدائی پروانہ" کے یہ الفاظ یعنی حی وقیوم کی طرف سے جسے کبھی موت نہ آئے گی۔

ان لوگوں کے نام

"جو حی وقیوم (بن چکے ہیں) اور کبھی نہ مریں گے"

اس میں "الحی القیوم" کے الفاظ سے اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مطلب وہی ہے کہ حیات اور زندگی کی صفت موجودہ خاکی زندگی میں جن لوگوں کو ملی وہ حی اور زندہ ہوگئے اسی طرح آئندہ بہشتی زندگی میں حیات کے ساتھ "قیومیت" کی صفت بھی بندوں کو ان کے خالق کی طرف سے جب عطا فرمادی جائے گی، تو الحی یعنی زندہ ہو جانے کے ساتھ وہی بندے "القیوم" بھی بن جائیں گے یعنی ان کی پیدا کی ہوئی مخلوقات میں قیام وبقا کی خاصیت بھی اسی طرح نمایاں ہوگی جیسے آج "قیوم السموات والارض" خالق تعالیٰ جل مجدہ کی پیدا کی ہوئی کائنات ومخلوقات میں ہم قیام وبقاء کے اسی رنگ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اپنے خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے رحمت بی نے جو خبر دی تھی کہ نہریں جو جاری تھیں، ان کو میں نے دیکھا کہ نالیوں کے بغیر یوں ہی سطح زمین پر بہتی چلی جارہی ہیں، خواب کا یہ جزء بھی معنی خیز ہے۔ شر وخیر اور بھلائی برائی کے اس معجون مرکب میں جس کا نام دنیا ہے یہاں بھی دریا، ندیاں، نہریں بہتی ہوئی ہمیں نظر آتی ہیں، جو نگاہوں کو بھلی بھی معلوم ہوتی ہیں، لوگ خاص طور پر بہتی ہوئی جوئباروں کی مستانہ رفتار کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

لیکن اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ بہتے ہوئے پانی کے اس نظارہ میں کدورت ان ہی دریاؤں، ندیوں، نہروں کے ساحل کی دلدلی زمین اور کیچڑ وغیرہ کی گندگیوں سے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے، ملیریائی جراثیم کہئے یا زہریلے گیس، ان ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے دریاؤں، ندیوں، نہروں کے علاقے آب وہوا کے لحاظ سے عموماً مضر اور صحت کے لئے حد سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن رحمت بی کو بہشتی نہروں کی جس خصوصیت کا مشاہدہ کرایا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کی نہریں ان آلودگیوں سے پاک ہوں گی۔ قرآن میں "بہشتی چشمہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ آگاہی جو بخشی گئی ہے یعنی یہ فرمانے کے بعد کہ

عیناً یشرب بھا — "یہ ایک چشمہ ہے، پئیں گے اس
عباد اللہ — چشمہ سے اللہ کے بندے"

آگے جو یہ ارشاد ہوا ہے یعنی:۔

یفجرونھا تفجیرا۔ — "جاری کریں گے اس چشمہ کو
(القرآن الکریم) — (اللہ کے یہی بندے) اچھی طرح"

آیت کریمہ کے آخری الفاظ:۔

"یفجرونھا تفجیرا"

کا اقتضاء یہی ہے، کہ خود اہل بہشت ہی اس چشمۂ آب کے خود جاری کرنے والے ہوں گے، گویا ان کی کن فیکونی اور قیومی مخلوقات میں جنت کا یہ "چشمہ" بھی شریک ہوگا، ظاہر ہے کہ اس قسم کی مخلوقات کا وجود کلیۃً اپنے خالق کے ارادے اور قیومی توجہ کا دست نگر ہوتا ہے۔

آپ اپنی خیالی قوت سے آج بھی چاہیں تو ذہن میں ایسی نہروں کا جال بچھا سکتے ہیں، جو نالیوں کے بغیر ہر طرح دوڑتی ہوئی آپ کو نظر آئیں، بہشت میں یہی چیز واقعہ کا قالب اختیار کرلے گی۔

(باقی آئندہ)

قسط نمبر ۴:۔

بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک

(حضرت مولٰنا مناظر احسن گیلانی)

بہر حال بہشتی بستیوں کے آباد کاروں کو "الحی القیوم" کے نام ہی سے نہیں بلکہ ان صفات کا جو کام ہے، اس کام کی قدرت و قوت سے سرفرازی، خدائے حی وقیوم کی بخشی ہوئی دوسری نعمتوں کے ساتھ انعام و اکرام ہی کی ایک شکل ہوگی عبوری زندگی کے موجودہ خاکی دور میں اپنے خالق و مالک رب رحیم کی مرضی کے مطابق جینے کا عہد کرکے اس عہد کے پورا کرنے میں جو جس حد تک کامیاب ہوں گے، اللہ کے یہی نیک بندے اور عباد صالحین دوسری زندگی کے بہشتی دور میں یہ پائیں گے کہ خدا کی مرضی بھی ان کی مرضی کے مطابق بن گئی ہے، بہشتی قلمرو میں داخل ہونے والوں میں قرآن ہی میں ہے کہ پکارنے والا پکار پکار کر یہ منادی کرے گا کہ:۔

ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ (پ ۳۰) "واپس ہو جاؤ اپنے پروردگار کی طرف "راضیۃ مرضیۃ" بنے ہوئے"

حاصل "راضیۃ مرضیہ" کے ان الفاظ کا یہی ہے کہ تم خدا سے راضی بنے ہو اس لئے اپنے خدا کو پاؤ گے کہ وہ تمہاری مرضی کے مطابق بنا ہوا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ کائنات کی تخلیقی قوت ہی جس کی مرضی کے مطابق بنجائے گی اسی کے سامنے یہ تجربہ پیش آئے کہ جو کچھ چاہا جا رہا ہے وہی پورا ہو رہا ہے، جو کچھ مانگا جا رہا ہے وہی مل رہا ہے، تو اس کے سوا اور ہوتا کیا۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہی سیدھی سادی بات، مالیخولیا کے بعض مریضوں کے دماغ میں پہونچکر ایک ایسے "فلسفہ" کی گتھی بن گئی، جسے مسکینوں کا یہ گروہ خود بھی سلجھانا چاہتا ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے سلجھاتا ہوگا۔

میرا مقصد یہ ہے کہ بعض نیم فلسفیانہ اور بعض نیم صوفیانہ مکاتب خیال میں:۔

"فنا فی الاصل"

کی اصطلاح مسئلہ نجات، یا مکتی کے سلسلہ میں جو مستعمل ہے، سمجھا یا جاتا ہے کہ دینی مجاہدات، اور روحانی کاوشوں کا آخری نتیجہ یہ ہے، کہ:۔

"جو مخلوق بن کر پیدا ہوئے ہیں خدا کے وہی بندے
اپنی روحانی ارتقاء سے (العیاذ باللہ)،
"خدا بن جاتے ہیں"

الفاظ سے ہٹ کر اصل حقیقت اور واقعہ کی گہرائیوں تک اترنے کے سلیقہ سے جو محروم ہیں، اس قسم کے شاعرانہ مزاج والے ممکن ہے "فنا فی الاصل" کے ان الفاظ میں لذت و سرور کی ذہنی کیفیت بھی محسوس کرتے ہوں۔ لیکن ان ہی سے میں پوچھتا ہوں کہ مخلوق (بندہ) جو دوسرے سے پیدا ہوا، وہی خالق اور خدا یعنی ایسا وجود کیسے بن سکتا ہے جو کسی سے پیدا نہیں ہوا۔

اس کا مطلب تو یہی ہوا، کہ ایک ہی چیز پر یہ بھی صادق آئے کہ وہ دوسرے سے پیدا ہوئی، اور یہ بھی کہ دوسرے سے پیدا نہیں ہوئی۔ آخر اس کھلے ہوئے منطقی تناقض کی گنجائش اپنی عقلوں میں مسکینوں کا یہ گروہ کیسے نکال لیتا ہے۔ وہ کبھی

تشبیہوں اور مثالوں سے کام لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ خدائی وجود کو سمجھو کہ وہ دریا ہے۔ اور بندوں کی ہستیاں اسی دریا کے قطرات ہیں۔ قطرے، دریا سے کچھ دن کے لئے الگ کر دیئے گئے ہیں۔ آخر میں وجود کے اسی دریا سے یہ قطرے گھل مل جائیں گے۔

قطع نظر اس سے کہ جس کی ذات سبے ہمتا، اجزار اور طول وعرض وغیرہ کے مادی صفات سے پاک ہے، اسی کو دریا جیسی عریض وطویل شئی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ میرے دل میں تو یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے، جس کا ذکر عیسائیوں کے جنتی نظریہ کے متعلق کر چکا ہوں، یعنی عیسائی عقیدے کی رُو سے یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ "نیک آدمی مرنے کے بعد ملک اور فرشتہ بنا دیا جائے گا" اسی کا نام عیسائیوں نے "رُوحانی جنت" رکھ چھوڑا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ عیسائیوں کی یہ جنت انسانوں کے نیک اعمال کی جزا کی جگہ مجھے تو یہ عیسائیوں کی سزا ہی کی شکل نظر آتی ہے۔ فرشتہ بنا دئے جانے کا مطلب یہی تو ہے کہ فطرت انسانی کے سارے جبلی احساسات سے محروم ہو کر آدمی جنت میں داخل ہوگا۔ جنت تو جنت میرے نزدیک تو موجودہ خاکی زندگی میں بھی شاید کوئی عیسائی بھی اس "بہشتی نعمت" کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا ذائقہ، شامہ، سامعہ، باصرہ، لامسہ وغیرہ احساسات کی لذتوں سے محروم ہو جانے والا، اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہے کہ سخت بیماری میں وہ مبتلا ہو گیا ہے۔ محرومی تو محرومی یہاں حال تو یہ ہے کہ جنسی لذتوں سے محرومی نہیں بلکہ ان کے ضعف ہی پر کم از کم یونانی اطباء کے مطب کی رونق کیا کم قائم ہے، اور یورپ میں عمل تقلیم[1] کی بدولت کمانے والے لاکھوں بلکہ کروڑ ہا کروڑ کما رہے ہیں۔ بتایا جائے کہ اس بازار کی گرمی کا راز اسی میں تو پوشیدہ ہے کہ آدمی فرشتہ بننا نہیں چاہتا، بلکہ ملکوتیت کے آثار کو اپنے لئے مرض اور بیماری یقین کرتا ہے۔

پھر جیسے عیسائیوں کی جنت بجائے اجر وجزاء کے انسانی فطرت کے لئے سزا اور عذاب بنجاتی ہے، میں تو خیال کرتا ہوں کہ کچھ یہی انجام "فنا فی الاصل" کے اس صوفیانہ فلسفہ کا بھی نظر آتا ہے، جو مخلوق ہیں، وہ خالق اور جو بندے ہیں، وہ خدا بن جائیں گے۔ ان بے معنی الفاظ کا زیادہ سے زیادہ شاید یہی مآل ہو سکتا ہے کہ خدا رسی کی آخری منزل پر پہونچنے کے بعد بندوں کا وجود کلیۃً محو اور معدوم ہو جاتا ہے اور صرف خدا ہی کی ذات باقی رہجاتی ہے۔

ایسی صورت میں ان ہی لوگوں سے پوچھ کر دیکھئے جو ہ

دِل کا ہر قطرہ ہے صوت انا البحر
میں اس کا ہوں ہمارا پوچھنا کیا

کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں کہ قطرہ کو توڑ کر دریا میں ملا دیا جاتا ہے یعنی نعرہ لگانے والے صاحب کو ختم کر کے معدوم کر دیا جاتا ہے، اور یوں قطرے کو دریا میں کھپ جانے اور جذب و محلول ہو جانے کا موقعہ عطا کیا جاتا ہے، کیا اپنی اصل میں فنا ہونے کے لئے وہ تیار ہو سکتے ہیں؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی انفرادی شخصیت کے شعور ہی سے نجات یافتہ رُوحوں کو جب محروم کر دیا جائے گا تو اپنے نیک اعمال کی جزا وصلہ پائے گا کون؟ صاف لفظوں میں اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو ناپید اور معدوم تھے، اپنے ان ہی بندوں کو پیدا کر کے خدا ہمیشہ کے لئے پھر نیست و نابود کر دے گا، اور اپنی ساری رُوحانی جان گسل

---

[1] کہتے ہیں کہ آجکل یورپ میں بڈھوں کے پڑانے درکار رفتہ غدود (گلینڈ) کو آپریشن کر کے نکالدیا جاتا ہے، اور گوریلا، چمپانزی وغیرہ ایسے بندر جو جسمانی خصوصیت میں انسانوں سے زیادہ قریب ہیں، اُن ہی کے غدود کا قلم ان کے بڈھوں میں لگا دیا جاتا ہے مشہور یہی ہے کہ ساٹھ ساٹھ، ستر ستر برس کے بوڑھوں میں اس تقلیمی عمل سے تیس تیس سال کے جوانوں کی شبابی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ۱۲ (گیلانی)

ریاضتوں، محنتوں کا صلہ اسی شکل میں اپنے مقبول بندوں کو عطا کریگا۔ انعام واکرام اگر اسی کا نام ہے۔ تو سزا و انتقام خدا کے کس سلوک اور برتاؤ کی تعبیر ہو گی؟۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ "نجات" کہئیے یا "مکتی" کے مسئلہ میں مذاہب و دیانات، کی صحیح تعبیروں سے بعض لوگ ۔ "فنا فی الاصل"

کی غلط فہمیوں کے شکار ہوئے، اسی طرح نجات اور مکتی سے محروموں کے متعلق بعض آگاہیاں جو نبوات ورسالات کی راہوں سے حاصل ہوئی تھیں، ان ہی سے جہل و نادانی، کی دل چسپ طلسمی بھول بھلیوں میں سادہ لوحوں کا ایک قابل رحم طبقہ پھنس گیا۔

اُن غریبوں کو یہ باور کرادیا گیا ہے، کہ انسان کے سوا زمین پر جتنی بھی جاندار ہستیاں چل پھر رہی ہیں، خشکی پر رینگ رہی ہیں، یا تری میں تیر رہی ہیں۔ الغرض سارے مچھر، پسو، کھٹمل، پانی کے کیڑے، مکوڑے، بھانت بھانت کی چیونٹیاں، دیمک، چھپکلیاں، گرگٹ، سانپ، بچھو کتے، بھیڑیے، شیر، لومڑی، گائے، بیل، بھینسے، بکریاں، کوے، چیل، مرغیاں، بطیں، کبوتر، بٹیر اور تیتر طوطے، مینے، غرض یہ سارے حیوانات جو جی جی کر اپنے اپنے فرائض پورا کر کر کے غائب ہوتے رہتے ہیں، ان میں بعضوں کا حال یہ ہے کہ خاص خاص موسموں میں کروڑوں کروڑ ہا کروڑ کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں، اور پھر پتہ نہیں چلتا کہ کہاں چلے گئے؟

بہرحال زمین پر چلنے والے، پانی میں بسنے والے، فضاء میں اُڑنے والے، زندگی کے ان سارے مظاہر کے متعلق وہ باور کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ سب کے سب نجات سے محروم رہجانے والے

"سزا یافتہ انسانوں ہی کی سزائی شکلیں ہیں"

گنہ گار، پاپی آدمی مرنے کے بعد ان ہی جونوں میں جنم لے کر سزا بھگت رہا ہے، حالانکہ صرف مچھروں ہی کی تعداد ہر موسم میں جتنی پیدا ہو جاتی ہے، گنہ گار تو گنہ گار شائد سارے انسان نیک ہوں، یا بد، جواب تک پیدا ہو چکے ہیں ان کی تعداد اور ایک موسم کے پیدا ہونے والے مچھروں کی تعداد برابر نہیں ہو سکتی، مگر کہنے والوں نے یہی کہدیا، اور ماننے والوں نے یہ پوچھے بغیر کہ آخر یہ دعویٰ جو تم کرتے ہو اس کی بنیاد کیا ہے؟ دعویٰ کا بار ثبوت مدعی کے سر ہوتا ہے، لیکن دعویٰ بھی وہی کرتے ہیں، اور پھر دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ میرے اس دعوے کو غلط قرار دینے کی وجہ تم ہی بیان کرو، حالانکہ منطقی طور پر یہ دعویٰ کرنے والوں کا قدرتی فرض ہے کہ اس کی دلیل پیش کرتے، بتاتے کہ مرنے کے بعد کتوں کے قالب میں مثلاً روحوں کو منتقل ہوتے ہوئے آنکھیں دیکھ رہی ہیں، تو پھر اس مشاہدہ کا تم انکار کس بنیاد پر کرتے ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والا بیچارا کہاں گیا؟ اس کا جواب نہ ہماری آنکھیں دے سکتی ہیں، نہ کان، نہ دوسرے حواس سے اس سوال کا جواب ہم حاصل کر سکتے ہیں، لے دیکر صرف مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی بخشی ہوئی آگاہیوں کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے، کہ وہی "الغیب" کے ترجمان شہادت و غیب کے درمیان علمی واسطہ کا کام دیتے ہیں۔ (باقی بر صفحہ)

لہ مثلاً مچھروں، یا مکھیوں ہی کو دیکھئے کہ سال کے کسی خاص موسم میں دیکھا جاتا ہے کہ دنیا ان سے بھر گئی، پھر رفتہ رفتہ گھٹتے ہوئے اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ناپید ہو گئیں، ان میں ایک ایک جنس کا حال یہ ہے کہ اربوں، اور کھربوں میں ان کے اعداد وشمار کو مقید کرنا مشکل ہے، پیدائش سے زیادہ ان کے ناپید ہو جانے کا یہ تماشا عجیب ہے، جن آبادیوں میں مچھر پھیل جاتے ہیں، اگر مانا جائے کہ ان ہی آبادیوں میں وہ مر بھی جاتے ہیں، تو چاہیے تھا کہ ہر گھر سے روزانہ منوں کی مقدار میں مچھروں کی لاشیں برآمد ہوتیں، کچھ یہی حال مکھیوں اور اس قسم کے دوسرے حشرات الارض کا بھی ہے۔م

م ان کی پیدائش اور ناپید ہونے کا سوال ایک سوال ہے، ضرورت ہے کہ دنیا اس کی طرف توجہ کرے، اور بات ان ہی موسمی حشرات ہی تک محدود نہیں ہے جنگل کے سارے جانور طیور سب ہی کے متعلق یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔

کی راہوں سے اس کا علم حاصل ہوا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذاہب و ادیان کی جتنی بنیادی کتابیں اس وقت جس حال میں بھی پائی جاتی ہیں اُن میں اس عجیب و غریب دعوی کا سُراغ ڈھونڈھنے والوں کو آج تک نہیں ملا ہے، صرف بعض قوموں (مثلاً مصریوں، یونانیوں کے خرافاتی یا فلسفیانہ لٹریچر) میں کہتے ہیں کچھ ایسی باتیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ وسوسہ بعضوں کے قلوب میں پیدا ہوا تھا۔ (باقی آئندہ)

بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک کا بقیہ

اِس میں شک نہیں، کچھ دنوں سے اِس فلسفیانہ وسوسہ کو بعض لوگوں نے اپنے "مذہبی عقائد" میں شریک کر لیا ہے، اور یوں گویا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مذہبی پیشواؤں تک کشف و اشراق

پانچویں اور آخری قسط :-

بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک

(حضرت مولٰنا گیلانی مدظلہ)

میرا ہی نہیں، بلکہ مجھ سے پہلے بھی بعض اسلامی مصنفین نے اِس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ اس قسم کی روایتیں جو اسلامی کتابوں میں بھی ملتی ہیں، مثلاً ایک طویل روایت ہمارے یاں کی تفسیری کتابوں میں جو یہ پائی جاتی ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے قرآنی آیت "فتاتون افواجا" (یعنی قیامت کے دن لوگ فوج در فوج کی شکل میں آئیں گے)" اِسی آیت کے متعلق دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو جواب میں ان کو اطلاع دی گئی، حاصل جس کا یہی ہے کہ مختلف طبقات کے لوگ مختلف شکلوں میں نمایاں ہوں گے۔ جن میں بعضوں کے متعلق فرمایا گیا کہ:-

بدل اللہ صورھم بعضھم علیٰ صورۃ القردۃ وبعضھم علیٰ صورۃ الخنازیر۔

"اللہ بدل دیگا اُن کی صورتوں کو پھر اُن میں بعض تو بندروں کی شکل میں ہونگے اور بعض سُوروں کی شکل میں ہوں گے۔"

روایت میں یہ بھی ہے کہ:-

اما الذین فی صورۃ القردۃ فالقتات من الناس ؕ اما الذین فی صورۃ الخنازیر فاکلۃ السحت۔ (درمنثور صـ۳۰۷ ج۶)

"پھر بندروں کی شکل والے تو وہ ہوں گے جو آدمیوں میں چغل خور ہیں، اور سوروں کی شکل حرام کھانے والے لوگ ہوں گے"

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ خاکی دُنیا کے حیوانات، اور جانوروں وغیرہ کی طرف سے ہٹا کر اسی:-

"تجسد ارواحؒ"

کے مسئلہ کا رُخ اس درمیانی وقفہ کی طرف اگر پھیر دیا جائے جس سے

موت کے بعد اور انسانیت کے آخری انجام (الجنۃ والنار) سے پہلے مرنے والے آدمیوں کو گزرنا پڑتا ہے، ہم جس کی تعبیر "عالم برزخ" یا "عالم قبر" وغیرہ کے عنوانوں سے کرتے ہیں، تو اس زمانہ کا یہودی مذہب جس کی بُنیادی کتابوں سے "بعث بعد الموت" (یعنی مرنے کے بعد جی اُٹھنے) کے عقیدے ہی کو خارج کر کے جزا و سزا کے قانون کو

لہ ارواح ہی نہیں، بلکہ معانی اور صفات کا جسدی قالب اختیار کر لینا، ایک ایسا واقعہ ہے جس کے تجربہ کا آغاز اسی خاکی زندگی میں عموماً لوگوں کو رؤیا اور خواب کی حالت میں کرایا جاتا ہے۔ تاویل و تعبیر کی بنیاد زیادہ تر اسی مناسبت پر قائم ہے جو صفات و معانی اور ان کے جسدی قالب میں ہوتی ہے، خواب میں دکھایا جاتا ہے، کہ دودھ پلایا گیا۔ تعبیر دینے والا کہے گا، کہ علم کی نعمت خواب دیکھنے والے کو ارزانی ہوگی عموماً یہی حالات جن سے بیداری میں ہم متاثر ہوتے ہیں مثلاً نزلہ میں مبتلا ہیں تو خواب میں دیکھیں گے کہ پانی میں غوطے کھا رہے ہیں، صفراء کا استیلاء جن پر ہوتا ہے پاتے ہیں کہ آگ میں گھرے ہوئے ہیں، خواب میں بدن سے آدمی کا رشتہ جیسا کہ ظاہر ہے باقی رہتا ہے صرف بیرونی حواسوں پر تعطل کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، پھر جب بدن سے تدبیر و تصرف کا رشتہ قطعی طور پر ٹوٹ جاتا ہے، تو آدمی کی ذات کا نقطۂ شعور یا انا کے سامنے خواب سے زیادہ عجیب و غریب تجربے پیش آتے ہیں۔ دیکھنے والے خواب میں بھی دیکھتے ہیں کہ بدن سے الگ ہونے کے بعد پاؤں سے چل رہے ہیں، ہاتھ سے پکڑ رہے ہیں، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کانوں سے سُن رہے ہیں، اِدھر سے اُدھر منتقل ہو رہے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی ذات کا نقطۂ شعور یا انا ایک نیا چولا یا قالب اختیار کر لیتا ہے، پھر بدنی رشتہ سے زیادہ بے تعلقی موت کی وجہ سے جب ہو جاتی ہے تو انا کی یہی خصوصیت زیادہ نمایاں شکلوں میں تجربات کو پیش کرتی ہے، آدمی جو دُنیا اور دُنیاوی قصوں اور قضیوں میں ہمہ تن غرق تھا، مرنے کے ساتھ اگر یہ پائے کہ ادھر کی پسلیاں اُدھر یا ادھر کی اِدھر ہو گئیں، یعنی "ضغطۂ قبر" کے حادثہ میں اپنے آپ کو مبتلا پائے، تو یہ واقعہ ہی کے تمثل کی ایک شکل ہے، اژدہوں، اور درندوں کے قالب میں بد اعمالیاں اور "روح و ریحان" کی شکلوں میں نیک اعمالیاں سامنے آئیں تو برزخی عالم کا اقتضا بھی یہی ہے

اسی خاکی زندگی کے سکھ، دُکھ کے حالات کے ساتھ محدود کر دیا گیا ہے یا کرسچنٹی (عیسائیت) میں آدمی کے آخری انجام کو "رُوحانی جنت و دوزخ" کے غیر مفہوم الفاظ سے سمجھانے کی جو کوشش کی جاتی ہے، ایسے غیر مفہوم الفاظ جن کا کوئی مشخص و متعین اور واضح تخیل نہ اُن کے دماغوں میں پایا جاتا ہے جو اس رُوحانی "عقیدہ" کو سمجھانا چاہتے ہیں، اور نہ ان ہی کے سامنے اپنے اس عجیب و غریب انجام کی صحیح نوعیت آتی ہے نہ آسکتی ہے۔ جنہیں یہ عقیدہ سمجھایا جاتا ہے[1]۔ الغرض دُنیا کے ان دونوں مذاہب کے مقابلہ میں کم از کم معاد (یعنی انسانیت کے مستقبل) کے لحاظ سے ویدک دھرم وہ اسلام کے پیش کردہ نظام سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے، کہہ چکا ہوں کہ سرگ نرکھ کے نام سے ویدک دھرم کی کتابوں میں وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جس کی تفصیل اسلامی وثائق و مستندات میں کی گئی ہے، اور معاد ہی کیا ویدک دھرم کے ماننے والوں کے مشرکانہ کاروبار نے توحید کے مسئلہ کو جیسا ظاہر ہے مشتبہ بنا کر چھوڑ دیا ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ویدک دھرم بھی باہر سے شرک و اوہام کے دھوؤں میں امتداد زمانہ سے لپٹ گیا ہے۔ ورنہ توحید کا انگارہ ان دھوؤں کے اندر چھپا ہوا ہے، سچ تو یہ ہے کہ قرآن کی پڑھنے پڑھانے والی، سمجھنے اور سمجھانے والی اُمت بھی ہندوستان میں، جن آلودگیوں سے لت پت ہوئی اس کو دیکھتے ہوئے ویدک دھرم والوں کے طرزِ عمل پر تعجب نہیں ہوتا، سارا مُلک جیسے ان کے دیوتاؤں کے استھانوں سے بھرا ہوا ہے، کیا کوئی گن سکتا ہے ان "استمدادی مرکزوں" کو جنہیں نادان مُسلمانوں نے مختلف ناموں سے اسی ملک میں قدم قدم پر قائم کر رکھا ہے، لیکن مسلمانوں کی یہ ساری یادہ کاریاں کیا ان کے دین یا ان کی بے دینی کے نتائج ہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ دوسروں سے زیادہ اس کا جواب خود ان کا "ضمیر" ہی دے سکتا ہے؟

خیر بجائے خود یہ قصہ کافی طویل ہے عرض یہ کر رہا تھا، کہ بہشتی زندگی میں حیات کے ساتھ "قیومیت" کی نعمت سے بھی اہلِ جنت چوں کہ سرفراز ہوں گے۔ یوں خداوند غفور رحیم کی بخشی ہوئی اُسی نعمت کی راہ سے اپنی خواہش اور آرزو کے مطابق پیدا کر کر کے جس چیز سے جب تک چاہیں گے، اس سے مسرت اندوز ہوتے رہیں گے، "الحی القیوم" کے الفاظ اہلِ بہشت کے متعلق شیخ اکبر والی روایت میں جو پائے جاتے ہیں، ان کا یہی مطلب ہے، لیکن اس سے فنافی الاصول والے نتیجے کو پیدا کر کے یہ باور کر لینا کہ بہشتی زندگی میں مخلوق خالق یا بندے خدا بن جاتے ہیں، غلط فہمی نہیں بلکہ انتہائی کوڑھ مغزی، اور غباوت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جیسے برزخی یا قبری آثار و احوال کو بجائے عالم برزخ و قبر کے موجودہ عبوری زندگی میں تلاش کرنے والے سبھی منطقی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ترمذی میں "سوق الجنۃ" (یعنی بہشتی بازار) کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو یہ خبر منسوب کی گئی ہے یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ:-

ان فی الجنۃ لسوقا۔　　　"جنت میں ایک بازار بھی ہوگا۔"

لیکن حسب خواہش ہر ایک کے لئے ہر چیز خود مہیا ہو جاتی ہو، یا آسی خود ہی وہ تیار کر سکتا ہو، سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسے خطے میں اور اس کی آبادیوں میں بازار کی ضرورت ہی کیا ہوگی؟

غالباً اسی کا حد سے زیادہ معنی خیز یہ جواب دیا گیا ہے:-

ما فیہا مشری ولا بیع الا الصور من الرجال والنساء　　　"یعنی بہشتی آبادیوں کے اس بازار میں خرید و فروخت نہ ہوگا، مگر صرف مردوں اور عورتوں کی صورتوں کا۔"

* * * * *

(بقیہ صفحہ) ہاں خواب کے حالات کا اثر جیسے بدن پر کبھی دیکھا جاتا ہے اسی طرح خاکی قالب جس میں زندگی کی کافی مدت آدمی گزارتا ہے اسی قالب سے تدبر و تصرف کا تو نہیں لیکن "ماتوسیت" کا رشتہ باقی رہتا ہے، قبروں میں کبھی کبھی عالم برزخ کے آثار کا مشاہدہ اسی ماتوسیت کے اسی تعلق کا نتیجہ ہوتا ہے و القصۃ بطولہا

[1] آخر میں پوچھتا ہوں کہ "رُوحانی جنت" میں نہ حوریں ہوں گی نہ قصور نہ اشجار نہ انہار، الغرض ہم جن چیزوں کو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سُونگھتے ہیں، چھوتے ہیں، چکھتے ہیں، جب یہ سب کچھ نہ ہوگا، تو آخر وہاں ہوگا کیا؟ کیا صرف گھُپ اندھیرا، اور آدمی کا احساس، یہ جنت ہوئی، تو پھر دوزخ کس مقام کا نام رکھا جائے گا؟ در اصل رُوحانی جنت و دوزخ الفاظ بے معنی ہیں، الفاظ سے آگے بڑھنے کے بعد کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ۱۲

بظاہر یہی خیال گذرتا ہے، کہ "کن فیکونی قوت" کا تخلیقی عمل جس خاص قانون کا تابع ہے اسی قانون کی طرف مذکورہ الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ، کسی شئی کو خیال اور ذہن ہی میں سہی تخئیل کی قوت سے پیدا کرنے کی قوت اُسی وقت پائی جاتی ہے، جب ہم اس چیز کے ساتھ علمی تعلق پہلے قائم کر چکے ہوں، دوسرے لفظوں میں چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ معلوم بن جانے کے بعد ہی کوئی چیز مخلوق بن سکتی ہے۔ آپ تاج محل کو دیکھ کر اس کو اپنا معلوم اگر بنا چکے ہیں، تو جب چاہے اپنے خیال میں اس کو پیدا کر سکتے ہیں، لیکن تاج محل کو جس نے نہیں دیکھا ہے اور دیکھے بغیر عالمِ خیال میں اس کو پیدا کرنا چاہے گا، تو یقین کیجئے کہ اس کے سامنے تاج محل والی عمارت نہیں، بلکہ دوسری دیکھی ہوئی عمارتوں کی شکلیں اُبھریں گی، یا ان ہی دیکھی ہوئی تعمیروں سے کوئی مرکب شکل، لیکن تاج محل والی عمارت وہ کبھی نہیں ہو سکتی، گینڈے کو جس نے نہیں دیکھا ہے، تخئیل کی قوت سے لاکھ ذہن میں اُسے پیدا کرے وہ گینڈا نہ ہوگا، بھینسا ہوگا، ہاتھی ہوگا یا بھینسے اور ہاتھی کی کوئی مرکب صورت۔

الغرض کسی شئی کا مخلوق بننا موقوف ہے اس پر کہ پہلے اُس کو اپنا معلوم بنا لیا جائے، اندھا مادر زاد جس نے سرے سے کوئی عمارت ہی نہیں دیکھی ہو تخئیل کی قوت سے لاکھ کام لے لیکن کسی عمارت کو ذہن میں پیدا کر کے اپنے سامنے کھڑی کرنے پر وہ قادر نہیں ہو سکتا۔

"کن فیکونی قوت" کے عمل کے اس قانون کو پیش نظر رکھ کر سوچیے۔ اہلِ بہشت کو اپنی "کن فیکونی قوت" سے کام لینے کا اقتدار اس پیمانے پر بخشد یا جائے کہ پیدا کر کے اپنی مخلوقات کے وہ قیوم بھی بن جائیں گے۔ لیکن اپنے اس اقتدار کو ان ہی چیزوں ہی کی حد تک وہ استعمال کر سکیں گے، جو اُن کی "معلومات" میں شریک ہوں گی، مگر جن چیزوں کا علم ہی ان کو نہ ہوگا، ان پر اُن کی یہ اقتداری قوت ظاہر ہے کہ اثر انداز نہیں ہو سکتی، خالق حیّ و قیوم تو ہر چیز کے عالم ہیں[۱]، اِس لئے جس چیز کا جس وقت ارادہ فرماتے ہیں پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر بندوں کا علم خدا کے علم کی طرح غیر محدود نہیں ہے۔ پس بہشتی زندگی میں نئی مخلوقات کے لئے نئی معلومات حاصل کرنے کی حاجت ان کو پھر بھی باقی رہے گی ـــ "سوق الجنۃ" (بہشتی بازار) اسی حاجت اور ضرورت کو پوری کریگا اس بازار میں لوگ آئیں گے، جہاں نئی نئی ان دیکھی صورتوں کا علم اُن کو حاصل ہوگا، اور معلوم بنا لینے کے بعد ان ہی کو اپنی "کن فیکونی قوت" سے اپنی مخلوق بنا لیں گے روایت میں ہے کہ:۔

واذا اشتھی الرجل صورۃ دخل فیھا۔	"بازار کی دیکھی ہوئی ان صورتوں میں جس صورت کو پسند کریگا اسی صورت میں داخل ہو جائے گا۔"

٭ ٭ ٭

مطلب وہی ہے کہ ان نئی صورتوں یا فوٹو کو معلوم بنانے کے بعد اپنی صورت کو اسی کے مطابق لوگ بنا لیں گے، جب تک جی چاہے گا اسی شکل و صورت کے ساتھ رہیں گے، پھر بازار پہونچکر اَن دیکھی صورتوں سے نیا علمی تعلق پیدا کر لیں گے، اور گو روایت میں صرف مردوں اور عورتوں ہی کی صورتوں کا ذکر ہے، لیکن جنت کا یہ بازار لوگوں کے لئے نئی معلومات ہی کی فراہمی کا ذریعہ جب ہوگا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ مبصرات و مرئیات (جو چیزیں آنکھوں سے دیکھی جاتی ہیں)، مسموعات (کانوں سے جو سُنی جاتی ہیں) مشمومات (جو سُونگھی جاتی ہیں)، مذوقات (جو چکھی جاتی ہیں) ملموسات (جو چھو کر جانی جاتی ہیں) یا ان کے سوا علم و ادراک کے دوسرے ذرائع

---

[۱] یہ مسئلہ کہ کائنات جب موجود نہ تھی صرف خدا ہی کی ذات تھی اسوقت کائنات کا علم خدا کو کیسے حاصل ہوا۔ فلسفہ زدہ دماغوں کا ایک دلچسپ سوال ہے جس کا مفصل جواب آپ کو میری کتاب "الدین القیم" میں مل سکتا ہے، پہلے یہ سوچنے کی ہے کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ حق سبحانہ وتعالیٰ کے کمالات و صفات ہی کے یہ جلوے ہیں جنھیں کائنات کی شکل میں ہم اپنے سامنے پا رہے ہیں "الحمد للہ رب العٰلمین" قرآن کی پہلی آیت ہی سے یہ سبق پڑھایا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اپنی ذات و صفات و کمالات کا خدا جب عالم ہے، بس ان صفات و کمالات کے مظاہر و تجلیات کے جاننے کے لئے اپنی صفات و کمالات کا علم ہی اس کے لئے کافی تھا، بات نازک ہے کسی اہل فہم سے چاہئے کہ اس کا مطلب سمجھ لیا جائے ورنہ پھر خاکسار کی کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ ۱۲ +

کے متعلق نئی معلومات سے علمی ربط قائم کرنے کی آسانیاں اسی "سوق الجنۃ" میں مہیا نہ ہوں گی؟۔

کچھ بھی ہو، "الحی القیوم" بن جانے کے بعد بھی نئی معلومات کی فراہمی کے لئے ہر بہشتی بستی میں "سوق الجنۃ" (جنت کے بازار) کی حاجت باقی رہے گی۔ اور یہی دلیل ہوگی کہ بندے بہرحال بندے ہیں، وہ خدا اور خالق نہ بنیں گے نہ بن سکتے ہیں۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ زندگی کے کسی دور اور منزل ہی میں انسانیت کیوں داخل نہ ہو، بہرحال انسانیت انسانیت ہی باقی رہے گی، نہ فرشتہ بنے گی، اور نہ خدا، آدمی کی جبلت اور فطرت کے اقتضاءات بھی اس کے ساتھ ہوں گے، آج بھی قدرتی حسن و جمال اور اس کی جن دلفریبیوں سے آدمی کی فطرۃ متاثر ہوتی ہے، بہشتی زندگی میں بھی سرشت و جبلت کا یہی اقتضاء بھی آدمی کے ساتھ ہوگا۔

بہتی ہوئی نہروں، کھلے ہوئے اور لہلہاتے پھولوں ہرے بھرے سبزہ زاروں، نزہت انگیز مرغزاروں، سبک سیر جوئباروں سے، آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ نہ گدھوں ہی میں مسرت و نشاط کے جذبات ابھرتے ہیں اور نہ بیلوں اور بھینسوں میں قدرت کی جمال پاشیوں، حسن افشانیوں سے وجد و سرمستی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ خصوصیت انسانی فطرت ہی کے ساتھ مختص ہے کہ وہ ان بوقلموں رنگ رنگ کے نظاروں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے، قدرتی حسن کی ادا پر جھومتا، اور مست ہوتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ "جوہری خصوصیت" بشری جبلت و فطرت کو اگر غور کیا جائے تو یہی نظر آتی ہے، جسے ہم چاہیں، تو "جدت پسندی" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، آدمی کسی حال میں ہو، کہیں ہو، کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، جامد اور غیر سیال زندگی سے اکتا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خورد و نوش جیسی ضرورتوں میں بھی ایک ہی قسم کے کھانے سے آدمی جھنجھلا جاتا ہے۔ "سنسنی خیز" خبروں کے شائع کرنے والے اخبارات، نت نئے تماشوں، نو بہ نو، تازہ بتازہ نظاروں کے سلسلے میں کروڑہا روپیہ ہر روز جو صرف ہوتے رہتے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک کی سیر و سیاحت کا عام شوق جو لوگوں میں پایا جاتا ہے، یہ اور اسی قسم کے سلسلے کا روبار جس پر دنیا کی گرم بازاری موقوف ہے، غور کیجئے گا تو "جدت پسندی" کے اسی رجحان و میلان کو آپ دخیل پائیں گے۔

بہشتی زندگی میں "آدمی" اپنی جبلت و سرشت کی اسی جوہری خصوصیت کے ساتھ داخل ہوگا، شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "فتوحات" میں یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ:۔

فی الجنان فی کل حین من خلق جدید و نعیم جدید حتی لا یقع ملل فان کل شیئ طبعی اذا توالی علیہ امر ما من غیر تبدل لابد ان یصحب الانسان فیہ ملل۔ (فتوحات ص ۳۷ ج ۲)

"جنت میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ نئی آفرینش اور نت نئی نعمتیں ہوں گی، یہ اس لئے ہوگا تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں، کیوں کہ قدرتی بات ہے کہ ایک ہی چیز کے تسلسل سے جس میں تبدیلی نہ ہو آدمی میں اکتا جانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے"

وہی لکھتے ہیں کہ:۔

فاھل الجنان یدرکون فی کل نظرۃ ینظرونھا الی ملیکھم امرا و صورۃ لم یکونوا راؤھا قبل ذلک فتنعمون بجدوتھا وکذلک فی کل اکلۃ وشربۃ یجدون لھا جدیدا لذیذا لم یکونوا یجدونہ فی الاکلۃ الاولی (ایضاً)

"پس اہل بہشت اپنی ہر نظر میں اپنے بادشاہ (حق سبحانہ) پر ڈالیں گے نئی بات پائیں گے اور نئی صورت ایسی نئی بات، نئی صورت جسے انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا، اسی طرح ہر لقمہ اور پانی کے ہر گھونٹ میں نئی لذت اور نیا مزہ پائیں گے جسے پہلے کبھی نہ پایا تھا"

خود قرآن ہی میں دیکھئے سورۂ الکہف کے خاتمہ میں اس سے مطلع کرنے کے بعد کہ بہشتی زندگی سے لوگ منتقل ہونا چاہیں گے

(باقی آئندہ)

بقیہ بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک

یعنی لا یبغون عنہا حولا کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے کہ :۔

قل لو کان البحر مداداً لکلمٰت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً ۔	"اگر سمندر بھی میرے رب کے کلمات کے لئے روشنائی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا خواہ اس جیسے سمندر سے مدد کیوں نہ پہنچائی جائے"۔

تو ظاہر ہے کہ اس میں اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ کلمۂ "کُن" جس سے حق تعالیٰ چیزوں کو پیدا کرتے ہیں، ان کلمات کی نہ حد ہے نہ انتہا اور ان ہی کے مظاہر سے اہل الجنۃ لذت گیر مسرت ہوتے رہیں گے، تو بہشتی زندگی سے منتقل ہونے کی خواہش لوگوں میں کیوں پیدا ہوگی ۔ سورۂ بقر میں بھی فرمایا گیا ہے کہ فواکہ اور میوے اہلِ جنت کو جو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو کل ملا تھا، لیکن یہ واقعہ نہ ہوگا :۔ واتوا بہ متشابھا ۔ "دیے جائیں گے وہ پھل ملے جلے"۔ مطلب وہی ہے کہ بجنسہ ایک ہی چیز کبھی نہ ملے گی بلکہ ہمیشہ ملتی جلتی نعمتیں جنت میں تقسیم ہوتی رہیں گی۔ فقط